۷۸۶

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

خضرِ راہِ اقبال

۱۹۴۰

الموسوم بہ

سیرتِ اقبال

مؤلفہ

یکتا حقانی امروہوی

پبلشر

منشی ندیم صہبائی فیروزپوری

([illegible])

من آنم کہ من دانم

کجا ذات اقبال سراپا قابلیت اور کجا میری بے علم ہستی۔ بقولے "چہ نسبت خاک را با عالم پاک"۔ میں اگر چاہوں کہ ڈاکٹر علامہ سر شیخ محمد اقبال کے مکمل کلام نظم و نثر کو سمجھ سکوں تو اپنے فقدان علم کی وجہ سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ناممکن سا ہی ہے، لیکن اس کو کیا کروں کہ میرے دوست احباب مجھ کو اس قابل خیال فرماتے ہیں۔ اس کو میں انکی ذرہ نوازی پر محمول نہ کروں۔ تو اور کیا کروں۔ میری اک رباعی ہے جو بالکل حقیقت ہے ؎

ناسخ ہوں نہ آتش ہوں نہ سودا ہوں میں
اور یہ بھی نہیں کہ میر و مرزا ہوں میں
دنیائے سخن میں میں نہیں ہوں یکتا
لوگوں کا خیال ہے کہ یکتا ہوں میں

دوسری بات یہ کہ اس سے قبل ایک کتاب کے علاوہ جس کا نام مصائب عروس ہے جو باوجود کتابت وغیرہ ہو جانے کے چند وجوہ کی بنا

پر طبع نہ ہو سکی میں نے کوئی تصنیف و تالیف نثر میں نہیں کی، ہاں اک شوق ہے۔ ایک جذبہ ہے، اک ولولہ ہے اور قدرت کی طرف سے مادۂ موزونیت ودیعت ہو گیا ہے۔ شعر موزوں کر لیتا ہوں۔ اس خیال سے مجھ کو اس کا احساس ہے۔ کہ اغلاط کی فراوانی نظر آئے گی۔ جو میرے فقدان علم کا سبب ہے۔ ایسی صورت میں مَیں ناظرین کی ذات سے امید کرتا ہوں کہ وہ خامیوں پر نظر نہ فرمائیں گے۔

اس کے بعد مجھ کو جناب منشی ندیم صہبائی فیروزپوری اور محمد مختار صاحب لودہی اور حضرت حکیم انور سہوانی کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جو میرے لئے ضروری ہے۔

جناب منشی ندیم صہبائی فیروزپوری کی یہ ذرہ نوازی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ موصوف نے مجھ کو اس قابل تصور کیا کہ ڈاکٹر جیسے شخص کے حالات و واقعات اور مکمل سوانح حیات معہ کلام پر سَرسَری نظر کے مجھ سے تالیف کرائے۔ اور اُن کو شرفِ پسندیدگی بخشا۔

جناب محمد مختار صاحب کودہی نے مجھ کو اس کتاب کی تالیف کے لئے مواد فراہم کرنے میں مدد دی۔ میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں یہ مدد بھی موصوف کی میرے لئے معمولی مدد نہ تھی۔

حضرت حکیم انور سہوانی کی ذات میرے لئے اک قابل احترام ذات ہے آپ کی علم دوستی اور قابلیت کا اندازہ مجھ کو اچھی طرح ہے۔ آپ نظم و نثر لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اصناف نظم میں آپ کو

جس قدر تاریخ گوئی میں ملکہ ہے وہ قابل داد ہے "سیرت اقبال کا تاریخی نام بھی "خضر راہِ اقبال" آپ نے ہی تصنیف فرمایا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مقدمہ لکھنے کی بھی تکلیف گوارہ فرمائی۔ جس کے لئے موصوف نے خود دورانِ تالیف میں مجھ سے فرمایا تھا کہ "سیرت اقبال" کا مقدمہ میں لکھوں گا۔ جس سے آپکی وہ محبت جو مجھ سے ہے اور وہ شفقت جو آپ مجھ سے فرماتے ہیں ظاہر و باہر ہے۔

یکتا حقانی امروہوی
مؤلف

۲۵- اپریل ۱۹۴۰ء

مقدمہ

از حضرت حکیم محمد ضمان الرحمٰن صاحب انور سہوانی زبدۃ الحکماء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

دنیا رفتنی و گزاشتنی ہے۔ فانی ہے۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز بھی نقش برآب اور آنی جانی ہے۔ بڑی بڑی ہستیاں منصۂ عالم پر جلوہ گر ہوئیں اور حباب کی مانند بیٹھ گئیں۔ سیکڑوں نے خدائی کا دعوےٰ کیا اور فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ ہزاروں نے کوس "لمن الملک الیوم" بجایا اور دنیا سے بے نیل و مرام چل دیئے۔ لاکھوں نے اپنے اقتدار کی دھاک بٹھائی۔ مگر آج ان کا نام و نشان بھی نہیں۔ موت کے خونخوار چنگل سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ سیکڑوں شخصیتیں افق عالم پر مہر عالم تاب بن کر چمکیں مگر اُن کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ بادِ اجل کے جھونکوں نے ان کا چراغ بھی نہ بچ سکا۔

غرض سیکڑوں آئے اور چلے گئے۔ ہزاروں پیدا ہوئے اور مٹ گئے۔ لاکھوں نے گلشن وجود میں قدم رکھا اور صیادِ اجل کا شکار بن گئے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کون تھے، کب آئے اور کہاں چلا گئے۔

انہیں بہت سی ہستیاں ایسی بھی گذری ہیں۔ جنہوں نے بڑے بڑے کارنمایاں کئے۔ اپنی خدمات کو اپنی قوم اور اپنے ملک کے واسطے وقف کر دیا۔ اپنی زندگیاں دین و مذہب کی خاطر قربان کر دیں۔ اور جب تک وہ دنیا میں رہے دنیا والوں نے ان کو اپنے سروں پر بٹھایا۔ اپنے دلوں میں جگہ دی مگر چونکہ وہ اپنی کوئی یادگار دنیا میں نہ چھوڑ گئے تھے۔ اس لئے موجودہ دور میں کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔

دُنیا میں بقائے نام کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو تصانیف سے اگر کسی کا نام روشن رہ سکتا ہے تو سوانح حیات سے

علامہ سر محمد اقبال مرحوم بھی ایسی ہی برگزیدہ شخصیت اور خداداد قابلیت کے مالک تھے۔ جس سے عالمِ اسلام خصوصاً اور ہندوستان کا بچہ بچہ عموماً بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ اُن کے کمال کا نہ صرف عالمِ اسلام اور ہندوستان ہی معترف ہے بلکہ غیر ممالک اور غیر مذاہب بھی ان کا لوہا مانے ہوئے ہیں۔

اُنہوں نے اسلام کی جو خدمات انجام دیں وہ اظہر من الشمس اور ابہر من الامس ہیں۔ انہوں نے خفتہ قوم کو جگا دیا۔ پژمردہ دلوں میں روح پھونک دی۔ اُن کے کارنمایاں۔ ان کی علم دوستی اُن کی سیرچشمی۔ ان کا تبحرؔ۔ اُن کی قابلیت دنیا سے پوشیدہ نہیں اُن کو جس قدر بھی سراہا جائے، کم ہے۔ اور جس قدر بھی ان کے

بقائے نام کی کوشش وسعی کی جائے تھوڑی ہے۔ اُن کی ہستی ایک قابلِ تقلید ہستی تھی۔ اور ضرورت تھی۔ کہ وہ ابھی بہت رُوز تک دنیا میں رہتے مگر افسوس یکایک دستِ اجل ان کی طرف بڑھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کو ابدی زندگی میں پہونچا دیا۔

وہ ہم میں موجود نہیں رہے۔ لیکن بمصداق ؎

نامِ نیکِ رفتگان ضائع مکن

تا بماند نامِ نیکت بر قرار

اشد ضرورت تھی کہ اُن کے کارناموں کو صفحۂ قرطاس پر سجایا جائے ان کے سوانحیات اور حالاتِ زندگی کی تدوین کی جائے۔ تاکہ آئندہ نسلیں اس سے سبق لیں اور تقلید کریں۔ اور دنیا دیکھے کہ ہندوستان کی خاک پر کیسی کیسی ہستیاں درخشاں ہوئیں اور انہوں نے کیا کیا کام کئے۔

لیکن سوانح حیات کا لکھنا بھی آسان اور کسی معمولی شخص کا کام نہیں ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس کے لئے بھی کسی ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو ادیب ہو۔ شاعر ہو۔ واقعات و جذبات کی تصویر کشی میں یدِ طولےٰ رکھتا ہو۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

اس مشکل اور اہم کام کے واسطے قدرت نے میرے محترم دوست ابوالجذبات حضرت یکتا حقانی کو منتخب فرمایا۔ جن کی شخصیت چنداں محتاج تعارف نہیں۔ مختصر یہ کہ آپ امروہہ کے ایک مشہور ذی علم اور باکمال خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ ابتدائے سن شعور ہی سے تحصیل علم میں مصروف رہے۔ اور اس کو درجہ تکمیل تک پہونچایا۔ اور خداداد ذہانت کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں ممتاز رہے اور اقران و احباب سے اکثر میدانوں میں گوئے سبقت لے گئے ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

آپ ایک بہترین شاعر ہی نہیں بلکہ ادیب بھی ہیں واقعات اور جذبات کی تصویر کھینچنے میں آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے اور ہر اعتبار سے یکتا اسم بامسمّٰی اور یکتائے عصر ہیں آپکے ذوق شعر و سخن اور ادب دوستی سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔

چنانچہ انہوں نے حسب فرمائش محترمی جناب منشی ندیم صہبائی صاحب اس کار اہم کے لئے قلم اٹھایا۔ گویہ سیرت اقبال بہت ہی قلیل مدت اور بہت ہی عجلت میں لکھی گئی ہے مگر ماشاءاللہ

حضرت یکتاؔ نے حیات اقبال کا کوئی پہلو فروگذاشت نہیں کیا۔
سب سے پہلے شعر و شاعری پر خامہ فرسائی فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ شعر اور شاعری کیا چیز ہے۔ اور اس میں حضرت اقبالؔ کیا مرتبہ رکھتے تھے۔
اس کے بعد علامہ اقبالؔ کی مکمل اور جامع سوانحعمری ہے جس میں آپ کے آباؤ اجداد۔ آپ کے وطن۔ آپ کی جائے پیدائش پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ نے کہاں کہاں تعلیم پائی۔ کن کن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور اپنے ہم جماعتوں میں کیا مرتبہ پایا۔ کیا ترقی کی اور قوم کی کیا کیا خدمات انجام دیں۔ ملک و قوم کی نظر میں اُن کی کیا شخصیت تھی۔ نیز گورنمنٹ ان کو کیا سمجھتی تھی۔
غرضکہ سوانح کی تکمیل میں انتہائی کاوش اور تلاش سے کام لیا گیا ہے۔ اور ہر ہر پہلو پر کافی اور بہتر روشنی ڈالی گئی ہے۔
اس کے بعد علامہ مرحوم کے متعلق جو ملک کے ادیبوں نے قلم فرسائی کی ہے اور مضامین نظم و نثر لکھ کر ان کی ہستی کو اہل عالم کی نظر میں روشن کیا ہے اور ان کی موت اور بے وقت موت پر لفظوں کی شکل میں آنسو بہائے ہیں درج کئے ہیں۔ اور وہ صرف اس لئے کہ ملک اور قوم کو معلوم ہو جائے

کہ علامہ مرحوم کی جگہ خالی ہونے سے ملک و قوم اور خصوصًا ادب کو کیا کیا نقصان پہونچا اور کس قسم کا شخص دنیا سے اٹھ گیا۔

ان مضامین میں سے بہت سے مضامین اس قسم کے آپ نے فراہم کئے ہیں۔ جو کسی نہ کسی اخبار یا رسالہ میں طبع ہو چکے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو صرف کسی انجمن یا یوم اقبال میں پڑھے گئے ہیں۔ اور اب تک شائع نہ ہو سکے تھے۔ اور ان کا شایع ہونا ضروری تھا۔ چونکہ کتاب میں اتنی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے بہت کم مضامین پر اکتفا کیا۔ ورنہ ڈاکٹر اقبال پر جس قدر مضمون نگار حضرات نے مضامین اور شعراء نے منقبتیں اور نوحے لکھے ہیں وہ حقیقتًا اتنے ہی ہیں کہ ایک علیحدہ کتاب مرتب ہو جائے

بعد ازاں وہ قطعات تاریخ وفات وغیرہ جو شعراء ہند نے ڈاکٹر اقبال مرحوم و مغفور کی وفات حسرت آیات پر ملک کے گوشہ گوشہ سے لکھ کر آپ کے پسماندگان کو بھیجے ہیں یا رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے ہیں۔

قطعات تاریخ کے بعد سیرت اقبال کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے۔ جو "اوراق الخیال" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور اسی پر کتاب ختم کر دی گئی ہے۔

اس حصہ میں حضرت اقبال کے اردو کلام پر سرسری

نظر ڈالی گئی ہے۔ اور بانگ درا۔ اور بال جبریل کی اکثر نظموں میں سے ایک ایک دو دو شعر لے کر نمونتاً پیش کیا ہے اور روشنی ڈالی ہے کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کس کس قسم کی شاعری کی ہے اور کس کس رنگ میں تصانیف فرمائی ہیں آپ کے دل میں قوم کا کتنا درد تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر آپ کے کلام پر تفصیلی تبصرہ کیا جائے تو ایک نہیں کئی کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کے لئے وقت اور کافی محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن "سیرت اقبال" کو دیکھکر طبیعت خوش ہوتی ہے کہ یکتا صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں ہی سب کچھ رکھہ دیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے تو بیجا نہ ہوگا

ڈاکٹر اقبال کی شاعری کے چند نمونوں سے ہی آپ کے رنگ طبیعت اور خصوصیات کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو یکتا صاحب نے اس کتاب میں درج کئے ہیں۔

حقیقتاً "سیرت اقبال" حضرت اقبال مرحوم کے حالات زندگی کا ایک بیش بہا خزانہ اور ان کی مکمل سوانحیات ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو مقبول بنائے اور قوم کو توفیق عطا فرمائے کہ علامہ مرحوم کی تقلید کرے۔ آمین

قطعاتِ تاریخِ انطباع

(۱)

نوشت "سیرتِ اقبال" حضرتِ یکتا

ادیب و شاعرِ شیریں مقال و نیک خصال

بہ حسن و خوبیِ ترتیب بے عدیل و نظیر

بہ اعتبارِ زبان و بیاں، فقید مثال

زِ انتظامِ جنابِ ندیم صہبائی

بہ انطباع در آمد بصد ہزار جمال

سروشِ غیب پئے سالِ ہجریش انور

بگفت "نقشِ اکمل حیاتِ اقبال"

۲

رقم زد سوانح چو یکتائے دہر
دلِ من ازیں مژدہ گل گل شگفت
حیاتِ سر اقبال یادش بخیر
ز انورؔ پئے سال ملہم بگفت

۱۹۴۶

انور سہسوانی

شاعری

اور

شاعر

چونکہ مجھ کو حضرت اقبالؔ کی

سوانحیات

لکھنی ہے اور ڈاکٹر اقبالؔ ایک مکمل اور بہترین
شاعر تھے۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ میں شاعری
اور شاعر کی حقیقت سے بھی رُوشناس کرادوں
جس کے لئے چند اوراق وقف کئے گئے۔

مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

"شاعری"

"شاعری کیا چیز ہے" یہ اک سوال ہے جو ایک انسان دوسرے انسان سے ہر وقت کر سکتا ہے۔

"سنٹ آگسٹن"

سنٹ آگسٹن اس متذکرۂ بالا سوال کے جواب میں کہتا ہے۔ کہ "مجھ سے نہ پوچھو تو مجھے معلوم ہے، اور اگر پوچھو تو میں نہیں جانتا کہ شاعری کیا چیز ہے۔

"کارلائل"

کارلائل کہتا ہے کہ شاعری ایک سُریلا اور مترنم خیال ہے جو نسان اپنی کسی مستی اور کیفیت میں ظاہر کرتا ہے۔

"شیلے"

شیلے کے نقطہ نظر سے شاعری "قوت متخیلہ کے اظہار اور انکشاف

"اڈلین"

اڈلین کی دانست میں، تخیل کو متأثر کرنے کی قابلیت شاعری کی جان اور اس کی معراج کمال ہے۔

"زرتشت"

زرتشت کا خیال ہے۔ کہ غیر مانوس چیزوں کو دنیا کی مانوس اشیاء میں داخل کرنا شاعری کہلاتا ہے۔

"میکالے"

"میکالے" کہتا ہے کہ شاعری اک فن ہے جس میں الفاظ سے وہی کام لیا جاتا ہے۔ جو نقاش رنگوں سے لیتا ہے۔ لیکن یہ فن اکتسابی نہیں بلکہ قدرتی ہے۔ یعنی۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ شاعری فنون لطیفہ میں سے ایک لطیف ترین فن ہے۔ جس کا مادّہ قدرت کی طرف سے انسان کو عطا ہوتا ہے"

"قدرت جس کو چاہتی ہے فنِ شعرگوئی سے نوازتی ہے اور جب

کو نہیں چاہتی نہیں نوازتی۔

"طبع موزوں" یعنے دو مصرعوں کو کسی ایک بحر میں برابر صحیح تول لینے اور اپنے دل کی کیفیات کو ان میں ادا کر دینے کو شاعری کہا جاتا ہے۔ جو خداوند عالم ہر شخص کو نہیں عطا کرتا۔

اگر کسی انسان میں مادۂ موزونیت نہ ہو اور وہ کوشش کرے کہ میں شعر کہوں تو وہ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی شعر نہیں کہہ سکتا۔

اور برخلاف اس کے اگر وہ شخص جس کو قدرت نے طبیعت موزوں عطا فرمائی ہو اور وہ چاہے کہ "میں عالم شعریت سے دور رہوں۔ کیفیات کو ٹھکرا دوں احساسات کو پس پشت ڈال دوں مناظر قدرت سے متأثر نہ ہوں" تو ناممکن:

دن اور رات میں کوئی نہ کوئی لمحہ اس کے واسطے ایسا ضرور آتا ہے جس وقت وہ شاعری میں مکمل گم اور حل ہو کر رہ جاتا ہے یہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے انسان باوجود انتہائی قابلیت کے ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کر سکتے۔ اور بہت سے جاہل انسان بہترین شعر کہتے ہیں۔ اور اپنے جذبات کی صحیح تصویر کشی کرتے ہیں۔

جذبات انسانی کی عمیق ترین گہرائیوں سے دو چشمے اُبلتے ہیں "ایک شاعری"

"دوسرے موسیقی"
شاعری بغیر موسیقی کے مکمل نہیں ہوسکتی"
اور موسیقی بغیر شاعری کے کوئی چیز نظر نہیں آتی"
چند نغموں کے مجموعے کو موسیقی کہتے ہیں"
اور شاعری موسیقیت کے مجموعہ کا نام ہے"
شاعری جسم ہے اور موسیقیت اس کی روح"
شاعری انسان کے احساسات کا آئینہ ہوتی ہے"
اور انسان کے احساسات کا انحصار دو کیفیتوں پر ہے"
ایک کیفیت شادی و مسرت"
دوسرے کیفیت غم و الم"
اس ہی لئے شاعری کبھی شادی و مسرت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور کبھی
غم و الم کی۔

"شعریت"

شعریت زندگی کی روح ہے اور روح بھی روحِ لطیف"
موجوداتِ عالم کی ہر چیز میں شعریت کا عنصر موجود رہتا ہے۔ دنیا کا
ذرہ ذرہ۔ قطرہ قطرہ شعریت سے لبریز ہے، اور یہ شعریت ہی وہ چیز
ہے۔ جو ہماری زندگی کو زندگی بنائے ہوئے ہے۔ ورنہ یہ دنیا"
یہ پُر فریب اور ناپائیدار دنیا اس قابل ہرگز نہ تھی کہ ہم کو ایک لمحہ

بھی یہاں رہنا گوارہ ہو سکتا۔

قدرت کا انسان پر یہ وہ لطف و کرم ہے جس کے احسان کا بار دوش عبودیت سے کبھی اتر ہی نہیں سکتا۔

دنیا کیا چیز ہے !
مکمل شعریت "،
یہ کس کی تخیل ہے !
خلاق دو عالم کی !

کائنات کی جس چیز کو اٹھا کر دیکھئے شعریت سے لبریز ہے اور کیفیات حسن و ذوق سے پر۔

شاعری خالق عالم کا محبوب ترین مشغلہ ہے "

ازل سے ابد تک صرف شاعری ہی شاعری ہے۔ اور کچھ نہیں۔ نور و ظلمت، کفر و ایمان، حسن و عشق۔ شادی و غم، عیش و راحت۔ تکلیف و مصیبت کیا ہیں صرف قدرت کی شاعری اور قدرت کی تخیل !

خداوند عالم خود شاعر ہے " اور اس کے بندے جس قدر بھی شاعر ہیں اس کے شاگرد، الشاعر، تلمیذ الرحمٰن، جس کی صریح دلیل ہے۔ اور بین ثبوت۔

لیکن اس کے باوجود بھی دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو شاعری کو محض بے شغلوں کا ایک شغل بے معنے سمجھتے ہیں اور "شاعری کار بیکاراں نسیت "، کہہ کر اس کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔

اور اس سے قطعًا اثر پذیر نہیں ہوتے ان کی نظر میں شاعری کی کوئی
وقعت نہیں ان کا خیال ہے کہ جو جذبات شاعری کے ذریعہ ظاہر
کئے جاتے ہیں وہ دوسرے طریقے سے بھی منکشف کئے جا سکتے ہیں
قیود شاعری، بحر اور قافیہ ردیف کی الجھن کی کیا ضرورت ہے وہ
نہیں جانتے۔ کہ اگر جذبات اور خیالات کی ترجمانی اور اظہار میں
موزونیت پیدا کردی جائے تو روح اس سے کس قدر مسرور ہو جاتی ہے
اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی زندگی، ان کی عقل، ان کی نظریں،
صرف ظاہری اشیاء تک محدود ہیں۔ وہ محروم ہیں ان کیفیات و
لذات سے کہ جو حسین مناظر میں روح کے لئے پوشیدہ ہیں ان کی آنکھیں
صرف ظاہری ہیں۔ اور ظاہری مشاہدات تک رسا ان کے کان مادی
نغمے سننے تک ہیں۔ اور موسیقی کائینات سے بالکل بے بہرہ ہیں ان کے
دل سخت اور روکھے ہیں۔ وہ جذبات اور شورِ جذبات کے اثر سے
بالکل بے حس ہیں۔ اگر سچ پوچھا جائے تو اس قسم کے آدمی شاعری
کی خارجی اور مادی حدود سے بھی کوسوں دور ہیں۔ کیونکہ ان کی
روح موسیقیت حیات اور نغمات زندگی سے قطعًا ناآشنا ہے۔
... کے نقطۂ نظر سے شاعری صرف دروغ اور من گھڑت باتوں
... اور موثر الفاظ کے ساتھ موزوں کرنے کے سوا اور کچھ نہیں
... [illegible] اور رات زمین اور آسمان کے قلابے
... ہے کہ "مبالغہ شعر کا ضروری وصف ہے۔

لیکن ان کو نہیں معلوم کہ شاعر کے جذبات صرف حسن وعشق ہی کی تخیل تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ روزمرہ اور حسن عالمگیر بھی اچھی طرح پر ہیں۔

وہ کیا جانیں کہ شاعری مبالغات اور فرضی تخیلات سے کہیں زیادہ حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہے۔

شاعر حقیقتاً وہی ہے جو دیکھی بھالی اور سمجھی بوجھی چیزوں اور روزانہ صبح سے شام تک پیش آنے والی باتوں کو کسی خاص دلکش اور جاذب انداز سے اس طرح الفاظ میں ڈھالے کہ دل متاثر ہوئے بغیر رہے ہی نہیں۔ اگر اس کے اشعار سے کسی کا دل متأثر نہیں ہوتا تو اس کے یہی معنے ہیں کہ وہ شاعر۔ شاعر ہی نہیں ہے تاہم اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

شعر

شعر حقیقتہً اسی کا نام ہے کہ جس میں روزمرہ اور سامنے کی چیزوں کو کچھ اس انداز اور اس خوبی سے ظاہر کیا گیا ہو جس کو پڑھ کر حسن حقیقی نگاہوں کے سامنے آجائے قیود و تعینات اور حجابات

دور ہو جائیں اور جس کو پڑھ کر یا سن کر انسان وارفتہ ہو جائے۔

شعر کے پردے میں پوشیدہ ہے ساری کائنات
شعر سے بڑھ کر نہیں دنیا میں تفسیر حیات

شعر واقعی انسان کی زندگی کی تصویر اور عکس ہے، اس کا ترجمہ ہے، تفسیر ہے، اس کے دل کا آئینہ ہے، جو دوسروں کے لئے باعث دلچسپی اور قابل عبرت ہوتا ہے اس لئے کہ شعر شاعر کے دل کی کائنات ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ شعر کو اپنی اولاد سے زیادہ خیال کرتا ہے۔

شاعر

شاعر ایک مصوّر ہے ایک نقاش ہے جو بجائے رنگوں کے الفاظ سے تصویر کشی کرتا ہے وہ الفاظ کے ذریعہ ہر چیز کو اصل سے بڑھا دیتا ہے۔ اور ایسی ایسی چیزوں کی تصویر کشی کرتا ہے جن کی تصویر کسی صورت رنگوں کے ذریعے کھینچی ہی نہیں سکتی۔

مثلاً انسان کے رازہائے مخفی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ جذبات اور احساسات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ مناظر قدرت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ حسن حقیقی اور عشق والفت کی تصویر کشی کرتا ہے، اور اس انداز سے کہ نقل کو اصل سے بلند اور بہت بلند کر دکھاتا ہے۔ اور ان چند الفاظ کے مجموعہ کو جو چند قیود سے موزوں اور موسیقیت سے

لبریز ہو جاتا ہے۔ اس قابل بنا دیتا ہے۔ کہ اصل کو دیکھ کر دل اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا ایک شعر کو سن کر یا پڑھ کر گوشۂ تنہائی میں ہوتا ہے۔ مثلاً شاعر اس سبزہ زار کا نقشہ کھینچتا ہے جو صبح کے وقت شبنم یعنی اوس سے پر ہے کہتا ہے کہ۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

انیس

شعر پڑھ کر اور سن کر نگاہوں کے سامنے سماں بندھ جاتا ہے واقعہ ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم صبح صورت میں ایسے سبزہ زار میں کھڑے ہیں۔

یا ایک شاعر کیفیات کی اور وہ بھی کیفیات عشق و محبت کی اس طرح تصویر کھینچتا ہے۔ کہ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

شیفتہ

بہر حال شعر اک پر کیف اور موثر نغمہ ہے۔ جو دل کی گہرائیوں میں پانی کی طرح اتر جاتا ہے اور انسان کو مست و بے خود اور وارفتہ اور بے حد وارفتہ کر دیتا ہے۔ اور مست و بے خود کر بھی کیوں نہ دے۔ آخر شاعر اپنی تمام قوتوں کو صرف کر کے چند لفظوں کا مجموعہ

اس قابل بناتا ہے۔ کہ جو اس کے دل کی کائینات اور موجوداتِ عالم مناظرِ قدرت اور حقیقی حسن ومحبت سے پُر کھلاتا ہے جس وقت شاعر شعر کہتا ہے اس کا دماغ اس کا دل مادی دنیا سے دور اور کوسوں دور ہوجاتا ہے وہ موسیقیت روحانی کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور ان کے نغموں سے اس قدر لطف اندوز ہوتا ہے کہ خود نغمے پیدا کرنے لگتا ہے اور وہی شعر کہلاتے ہیں اس کو دنیا کی ہر شے بے نقاب نظر آتی ہے حجابات اس کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور وہ ہر شے کی روحانیت میں اپنی روح کو جذب کر دیتا ہے۔ اور اسکی حقیقت اور اس کی ہستی کو اپنی نگاہوں کے سامنے منکشف دیکھتا ہے۔ ہر چیز میں اس کو جلوۂ الٰہی کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ دنیا میں فردوسی زندگی کے لطف اٹھاتا ہے۔ جیسا شاعر خود کہتا ہے۔

شاعرِ فطرت ہوں جب کچھ فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرّہ ذرّے میں سما جاتا ہوں میں

جگر

زمانہ اور شاعر

کم وبیش ہر عہد اور ہر زمانہ میں شاعروں کی اتنی تعداد ضرور موجود رہتی ہے کہ فضا شعر وموسیقیت سے خالی نہ رہے لیکن اس کے

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ زیادہ تعداد اس قسم کے شعرار کی ہوتی ہے کہ جو شوقیہ شاعری کرتے ہیں۔ طبیعت موزوں ہو یا نہ ہو وہ طبع آزمائی سے باز نہیں آتے۔ خواہ دوسرے کام ہون منت ہی ہونا پڑے اور ان کا شعر شعر کہلانے کا مستحق ہو یا نہ ہو وہ شعر ضرور کہتے ہیں وہ۔ شاعر کہلانے کے شوق میں ادب اور فن شعر گوئی کو اس قدر بڑی طرح نوازتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ ان نام نہاد شاعروں کے کلام کا اگر صاحب عقل و دانش اور باعلم انسان مطالعہ کرے تو سوائے مبتذل اور عامیانہ خیالات کے کچھ نظر نہ آئے گا جو خلاف تمدن اور تہذیب ہوں گے اِک سنجیدہ انسان تو ان کو پڑھ کر یا سن کر کیا ہی خوش ہوگا۔ کوئی جاہل اور ناسمجھ بھی اس کیطرف صحیح صورت سے متوجہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ حقیقی شاعروں سے کسی زمانہ کا ماحول بالکل خالی رہتا ہو۔

عصرِ حاضر

اور

شاعر

زمانہ موجودہ کے شاعروں نے اپنا طرز بیان شعرائے متقدمین سے کچھ

علیحدہ رکھا ہے اور کچھ لوگ اس میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں پرانے لوگوں کا رنگ، وہ گل و بلبل، ہجر و وصل، قیس و لیلےٰ اور شیریں فرہاد کے افسانوں کا استعمال ترک کر دیا ہے اور مغربی شاعروں کے ہمخیال ہونے لگے ہیں

یہ واقعہ ہے کہ مغربی ادب کی تقلید نہ صرف غیر ضروری بلکہ مضر بھی ہے لیکن اس سے استفادہ حاصل کرنا بھی نہ صرف جائز۔ بلکہ اشد ضروری ہو گیا ہے۔

بالکل اس ہی نظریہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے مغربی ادب سے صرف اتنا ہی استفادہ حاصل کیا۔ اگر دور حاضرہ میں دیکھا جائے تو اقبال کا کلام ہندوستانی اور انگریزی یعنے مشرقی۔ اور مغربی ماحول کے درمیان نظر آئے گا۔ اس وقت میرے پیش نظر ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ہے اور ان ہی کے متعلق کچھ لکھنا ہے۔ جو بالترتیب ان کے سوانح عمری کے طور پر پیدائش سے لے کر وفات تک مع کلام کے تبصرے کے پیش کئے جاتے ہیں۔ و ہو ہذا۔

۱۳۱

علّامہ

سر محمد اقبال

مرحوم

ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم

کے

مکمل حالات زندگی از تاریخ پیدائش تا تاریخ

وفات درج کئے جاتے ہیں تاکہ اہل ادب کو علاّمہ

ڈاکٹر اقبال کی صورت کے ساتھ ساتھ سیرت

کا بھی اندازہ ہو جائے۔ اور اُن کی زندگی کا مطالعہ

کر سکیں۔"

مؤلف

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر اقبال کی ذات ہندوستان کیا بلکہ بیرون ہندوستان
یعنی غیر ممالک ایران، ترکستان، انگلستان وغیرہ کے لئے بھی محتاج
تعارف نہیں، ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ڈاکٹر اقبال کا نام
لیا جاتا ہے، ہر کہہ ومہ برنا و پیر کی زبان پر ڈاکٹر اقبال کا نام ہے
آپ ہندوستان کے مشہور و معروف نامور اور بلند پایہ شعرا اور
فلاسفروں میں سے تھے۔

آپ نے اپنی زندگی اور اپنی ہستی کو قوم مسلم کے لئے وقف کر دیا
تھا اور اپنی تصانیف میں جو کام کیا وہ سب قوم مسلم کے لئے ہی کیا

آپ اور آپ کے والد ماجد اور آپ کے دادا و پردادا مسلمان
تھے لیکن آپ کے جدّ بزرگوار کے دادا مسلمان نہ تھے۔ بلکہ ہندو تھے
لیکن جب سے آپ کے دادا نے اسلام قبول فرمایا تو مکمل مسلمان بن کر
دکھلا دیا کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔ اور انکی اولاد نے ان کی صحیح
پیروی کی اور اپنے نومسلم باپ دادا کے قدم بقدم چلتے رہے۔
ڈاکٹر اقبال کے ان جدامجد سے لے کر جو مسلمان ہوئے تھے۔ ڈاکٹر
اقبال تک کسی ایک کی ذات والا صفات چہرے بشرے، طور، طریق

شوہر کی خدمت اور یاد خدا و رسول ؐ میں بسر کی اور تربیت اولاد جیسی کی وہ دنیا پر ظاہر و باہر ہے کہ ڈاکٹر اقبال جیسا بیٹا دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جو خود آپ اپنی مثال تھا۔ اولاد والدین کا آئینہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال سے ان کے والدین کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کے والدین کی سکونت

آپ کا خاندان نور اسلام سے مشرف ہونے سے قبل کسی اور جگہ رہتا تھا۔ جس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ آپ کے جس جد اعلیٰ نے اسلام قبول فرمایا تھا وہ اپنے ہندو خاندان کو ان کے جائے سکونت پر چھوڑ کر بمقام سیالکوٹ چلے آئے تھے۔ اور وہیں سکونت اختیار کی اور وہیں جائز اور حلال ذریعۂ معاش اختیار کر کے اپنی زندگی بسر کی ان کی اولاد ڈاکٹر اقبال کے والد ماجد تک وہیں سکونت گزین رہی۔ ڈاکٹر اقبال کے والد ماجد نے بھی وہیں اپنی ملازمت چھوڑ کر تجارت شروع کی اور اس ہی تجارت میں اپنی زندگی پاکیزہ طریقہ سے گذاری۔

ڈاکٹر اقبال کی پیدائش

ڈاکٹر اقبال کی ولادت سیالکوٹ ہی میں ۱۸۷۶ء میں ہوئی آپکے

پیدا ہونے سے آپ کے والد ماجد کو تجارت میں اتفاقاً غیر معمولی منافع ہوا اور عزت و حرمت میں قدرتاً اضافہ جس کو آپ نے اپنے اس مولود سعید کی ولادت کی برکت پر مبنی کیا اور خیال کیا کہ یہ میرا بیٹا صاحب اقبال ہوگا۔ جس کی بنا پر موصوف نے آپ کا نام نامی محمدؐ اقبال رکھا۔ آپ کے والد ماجد اور آپ کی والدہ مکرمہ آپ سے بے پناہ محبت کرتے تھے آپ کے بچپنے ہی میں آپ کے چہرے و بشرے سے وجاہت جاہ وجلال اور اقبال کے آثار نظر آتے تھے۔

ڈاکٹر اقبال کی ابتدائی تعلیم

جب آپ کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو آپ کے والد ماجد نے آپ کو اردو کا قاعدہ خود پڑھانا شروع کیا، لیکن جس طرح طبیب اپنا یا اپنے گھر والوں میں سے کسی کا علاج صحیح نہیں کر سکتا۔ اسی طرح پڑھا لکھا انسان خواہ وہ فن معلمی سے واقف ہی کیوں نہ ہو اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دے سکتا،

چنانچہ آپ کے والد نے آپ کو ایک مکتب میں پہونچا دیا۔ ذہن اچھا تھا مکتب میں آپ اپنے ہم عمروں سے جلد پڑھتے اور یاد کرتے تھے قاعدہ کے بعد پہلی کتاب اور دوسری کتاب جلد جلد ختم کیں۔ جس کے بعد آپ کو پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں

آپ نے اپنی ذہانت اور طباعی سے ہر درجہ میں درجۂ امتیاز پایا اور پاس ہوئے اس کے بعد آپ مڈل اسکول میں پہونچے یہاں پہونچ کر بھی آپ ہر کلاس میں بہترین نمبروں سے پاس ہوئے اور امتیازی کامیابیوں پر انعامات حاصل کئے آپ کے اساتذہ آپ کے ہمیشہ مدّاح رہتے تھے اور آپ کی ذہانت اور محنت کی ہمیشہ داد دیتے تھے۔ اور بد شوق طلبار کے سامنے آپ کو مثال میں پیش کیا کرتے تھے۔

انگریزی تعلیم

اِس کے بعد آپ نے اِنٹرنس کا امتحان دیا اور کامیابی حاصل کی بعد ازاں آپ کو اپنی تعلیم کے لئے کسی کالج کی ضرورت ہوئی اور سیالکوٹ ہی میں ،، اسکاچ مشن کالج" میں داخل ہوے۔ اور بڑی دلچسپی سے تعلیم حاصل کی۔ اور وہیں سے ایف اے کا سارٹیفکٹ لیا۔

کالج میں اقبال کے استادِ اوّل

آپ کو کالج میں پرشین پروفیسر مولوی سید میر حسن صاحب

سیالکوٹی سے تعلیم حاصل کرنا پڑی جو فارسی اور عربی میں بدرجۂ اتم دستگاہ رکھتے تھے۔ اور کالج کے مایۂ ناز پرشین پروفیسر تھے آپ کا طریقہ تعلیم عجیب وغریب۔ حسین، اور دلآویز تھا۔ کہ طلبا علم کے دل میں آپ کا ہر لیکچر اور ہر درس عمر بھر کے لئے دماغ میں محفوظ ہو جاتا تھا۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولوی سید میر حسن صاحب سیالکوٹی بہترین شاعر اور فن شعر سے اچھی طرح واقف تھے اور اس میں ماہر تھے۔ آپ کے ہی ذوق شعر و سخن نے علامہ ڈاکٹر اقبال کے دل میں شاعری کی تحریک پیدا کر دی۔ ڈاکٹر اقبال اپنے اُن استاد کو بے انتہا مانتے تھے اور آپ کی بڑی حرمت کرتے تھے چنانچہ جب آپ کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد گورنمنٹ سے خطاب ملنے والا تھا۔ تو آپ نے سب سے پہلے یہ فرمایا تھا۔ کہ جس کو گورنمنٹ خطاب دینا چاہتی ہے۔ اس سے پہلے اس کے استاد کو خطاب دے کیونکہ وہ شخص پہلے خطاب کا مستحق ہے جس نے ایسا قابل شاگرد ملک کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ جو خطاب پانے کے قابل ہے۔ چنانچہ مولوی سید میر حسن صاحب کو گورنمنٹ کی جانب سے شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔ بہر حال جب تک آپ اسکاچ مشن کالج میں رہے۔ مولوی میر حسن صاحب سے فیض حاصل کرتے رہے۔ اسکے بعد آپ لاہور پہونچے۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔

گورنمنٹ کالج اور اقبال کے استاد دوم

ڈاکٹر اقبال کو خدا نے جیسا دماغ دیا تھا ویسے ہی قابل اور لائق اور اہل علم استاد عطا فرمائے تھے۔ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں آپ کو عربی اور فارسی کا منتہی استاد مولوی سید میر حسن صاحب جیسا اُستاد ملا تو گورنمنٹ کالج لاہور میں آرنلڈ جیسا فلسفہ کا مانا ہوا ماہر معلم۔ لیکن واہ رے اقبال جہاں پڑھا وہیں پر اپنا ایسا سکہ جمایا کہ استادوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ خود استاد کی قدر کرتا تھا اور استاد اقبال کو اپنی جان سے عزیز رکھتے تھے۔ آرنلڈ نے جو کچھ اس کے پاس تھا۔ اقبال کے سینہ میں بھر دیا۔ اور اس کو اپنا جیسا بنا کر کالج سے چھوڑا۔ ڈاکٹر اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کی ۱۸۹۷ء میں ڈاکٹر اقبال نے بی اے پاس کر لیا تھا اور ۱۸۹۹ء میں ایم اے۔ اور ایم اے میں کل یونیورسٹی میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوئے اور طلائی تمغہ پایا۔ اس کے بعد آپ کچھ دنوں تک اس ہی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ زمانہ ساتھ دے رہا تھا ستارۂ قسمت عروج پر تھا۔ کامیاب پروفیسری کی اور اپنی قابلیت کا سکہ جمایا۔

ڈاکٹر اقبال کی پروفیسری

اس طالب علم کے حصول تعلیم کی معراج ہے کہ جو جس اسکول یا کالج میں تعلیم پائے، اس ہی اسکول یا کالج میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد فوراً ماسٹر یا پروفیسر کی حیثیت سے نظر آئے۔ ڈاکٹر اقبال بھی گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی بی۔ اے اور ایم۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد فوراً پروفیسر فلسفہ مقرر ہو گئے۔ جہاں سے جو چیز حاصل کی حاصل کرنے کے بعد وہیں خرچ کرنی شروع کر دی۔ لیکن کیا کہنا دولت علم کا۔ کہ یہ جتنی خرچ کی جاتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے ڈاکٹر اقبال کو فلسفہ پڑھنے کے بعد فلسفہ ہی کی تعلیم دینی پڑی جس کی وجہ سے آپ کو علم فلسفہ سے اور بھی دلچسپی بڑھ گئی۔ آپ کالج میں جس طرح طالب علمی کے زمانہ میں تمام طالب علموں میں درجۂ امتیاز کے مالک تھے۔ اسی طرح پروفیسری کے زمانہ میں بھی کالج کے تمام پروفیسروں میں آپ کا نام خاص طور سے لیا جاتا تھا۔ یہیں آپ نے ایک کتاب اُردو زبان میں تصنیف کی جس کا نام "علم الاقتصاد" ہے۔ جو غالباً آپ کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں فلسفہ اور تاریخ پر لیکچر دینے پر پروفیسر مقرر ہوئے گئے آپکا لیکچر کالج کے طالب علم جس شوق سے سنتے تھے۔ کسی پروفیسر کا

لیکچر نہ سنتے تھے۔ آپ جو بات پیش کرتے تھے۔ اس کو مکمل حل کرتے تھے اور جس مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ دلیلوں کے ساتھ بحث کرتے تھے اپنی تقریر سننے والوں کے دلوں میں اتار دیتے تھے۔ آج وہ لوگ کثیر تعداد میں ہیں جنہوں نے کالج کی زندگی میں ڈاکٹر اقبال سے فیض علم حاصل کیا ہے اور بڑے بڑے ممتاز جگہوں پر کام کر رہے ہیں۔

۱۹۰۵ء میں سفر یورپ

ڈاکٹر اقبال کالج میں پڑھنے کے بعد خود کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے لیکن ابھی تک آپ کا دل حصول تعلیم سے سیر نہ ہوا تھا۔ ابھی آپ چاہتے تھے۔ کہ کچھ اور حاصل کیا جائے اور ہندوستان سے باہر چل کر تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا جائے۔ چنانچہ کالج سے ملازمت ترک کر کے ۱۹۰۵ء میں آپ ولایت روانہ ہوئے اور تقریباً ۱۹۰۸ء تک وہیں رہے کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور یہاں ان تین برس کے زمانہ میں مکمل فلسفہ اخلاق کا مطالعہ کیا۔ اور بہترین نمبروں سے فلسفہ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ آپ ولایت میں ان تین برس میں ہی کافی روشناس ہو گئے تھے یہ صرف اک قدرتی چیز تھی۔ قدرت خود کام کر رہی تھی۔ کیونکہ اقبال کو ڈاکٹر اقبال، سر اقبال، اور علامہ اقبال

بنا تھا۔ اور اس سے دینی اور دنیوی کچھ ایسے کام لینے تھے۔ جو دوسرا نہ دے سکتا تھا۔ اس ہی دور میں آپ نے ایک کتاب تصنیف کی جو فلسفۂ ایران پر مبسوط اور مدلل اور انتہائی روشن کتاب مانی گئی جس کے صلہ میں جرمن "میونخ یونیورسٹی" نے آپ کو پی۔ ایچ ڈی کی سند دی۔ یہ سند دے کر آپ انگلستان تشریف لائے اور یہاں بیرسٹری کے امتحان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور آخر کار امتحان دیا۔ اور پاس ہوئے۔ بعد ازاں لندن کے ایک اسکول آف پولٹیکل سائنس میں داخل ہوئے اور وہاں کی ڈگری حاصل کی آپ نے بیرسٹری کا امتحان بھی انگلستان ہی میں دیا اور کچھ دنوں رہنے کے بعد آپ نے وطن لوٹنے کا ارادہ کر لیا۔

لاہور کو واپسی

تین سال یورپ رہنے کے بعد ۲۷ رجولائی ۱۹۰۸ء کو ڈاکٹر اقبال لاہور تشریف لائے جہاں لوگ آپ کی واپسی کے مشتاق تھے۔ یہاں آپ کا وہ شاندار استقبال کیا گیا کہ باید و شاید۔ سیکڑوں اور ہزاروں جگہ پارٹیاں دی گئیں۔ شہر میں متعدد جگہ آپ کی تشریف آوری کے جلسے ہوئے۔
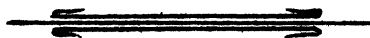
ڈاکٹر اقبالؒ پر ولایت کا اثر

ڈاکٹر اقبال ولایت تشریف لے گئے وہاں رہے وہاں تعلیم پائی اور ۔ ۔ ۔ ایک دو روز نہیں مکمل تین سال رہے لیکن سوائے تعلیم حاصل کرنے کے اور کسی قسم کی مغربی تہذیب یا معاشرت سے متاثر نہیں ہوئے ۔ اور متاثر بھی کیوں ہوتے ۔ کس مذہبی ماں باپ کے بیٹے تھے ۔ کس مشرقی انداز کے استاد سید میر حسن صاحب کے شاگرد تھے اس پر دل میں خود مذہبی جذبات موجیں لے رہے تھے ۔ آپ کے دل میں خود مذہب کا وہ پاک اور لطیف ولولہ تھا کہ جو اہل اسلام نے دیکھ لیا ۔ دوسری بات یہ کہ اقبالؒ صاحب اپنے بزرگوں اور استادوں سے جو بات ایک مرتبہ سن لیتے تھے ۔ اس کو ہمیشہ دل میں محفوظ رکھتے تھے ۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جب ڈاکٹر اقبالؒ کالج میں داخل ہو رہے تھے ۔ تو جناب کے والد ماجد نے تعلیم کی تھی کہ بیٹا کالج میں داخل تو ہو رہے ہو ۔ لیکن یہ خیال رکھنا کہ تم ایسے شخص کے بیٹے ہو کہ جو مذہب کے علاوہ دنیا میں کچھ نہیں جانتا ۔ کالج میں صرف تعلیم حاصل کرنے کے لئے جا رہے ہو تعلیم ہی حاصل کرنا اور وہاں سے فارغ ہو کر اسلام کی خدمت کرنا ۔ جس سے آخرت درست ہو ۔ مسلمان کے پیدا ہونے

کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اسلام کی خدمت کرے اور کچھ ایسے کارہائے
نمایاں کرے۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال نے کالج سے لے کر یورپ کی واپسی
تک اس کا خیال رکھا، جب آپ یورپ سے واپس تشریف لائے
تھے۔ تو آپ کو دیکھکر کوئی شخص یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ آپ
نے کبھی یورپ کو دیکھا بھی ہے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر
اقبال مکمل یورپین کی شکل میں یورپ سے واپس آئیں گے۔ لیکن تو یہ
ڈاکٹر تو انسان تھے غالب کا ایک مصرعہ ہے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ مصرعہ علامہ اقبال کے لئے بالکل غلط ثابت ہوا آپ انسان کہلانے
کے اس قدر مستحق تھے۔ کہ اگر آپ کو انسان مکمل نہ کہا جائے۔ تو ظلم
اور ناانصافی ہے۔ آپ خود کیا انسان تھے بلکہ آپ نے اپنی زندگی
میں لاکھوں کو انسان بنا دیا۔ اور اپنے بعد وہ چیزیں چھوڑ گئے۔ کہ
تمام عمر ہزاروں اور لاکھوں آدمی ان کے ذریعہ انسان بنتے رہینگے

ڈاکٹر اقبال کی خصوصی صفات

ڈاکٹر اقبال پاکیزہ طبیعت۔ بے لوث اور سادہ لوح انسان
تھے اپنے ارادوں کے پکے، قول کے دھنی جو زبان سے کہہ دیتے! اس
کا پورا کرنا فرض اولیں سمجھتے تھے، رحم، خداوند عالم نے آپ کے

حصہ میں کچھ زیادہ رکھ دیا تھا، کسی کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ صبر و استقلال آپ میں بدرجہ اتم موجود تھے قناعت و توکّل آپ کی ایک ممتاز اور خصوصی صفات تھیں۔ انسان کا انسان کے ہر اچھے برے، وقت کام آنا بہترین عادت خیال کرتے تھے۔ جوان میں موجود تھیں، ہمیشہ دوسرے کی بہتری چاہتے تھے ہر شخص کے کام آتے رہو۔ اخلاق کا مجموعہ اور علم مجلسی کے مالک تھے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے اسی محفل کی جان بن جاتے تھے۔ قوم کا درد آپ کے دل میں اس قدر تھا کہ آج تک لوگوں کی زبان پر ہے اور اپنی تمام تصانیف میں قوم کی ہمدردی پر روشنی ڈالی ہے۔

لباس

آپ بہت سادہ لباس میں رہتے تھے اور جو کچھ پہنتے تھے وہ بہت معمولی قیمت کا پہنتے تھے۔ پنجابی لباس یعنی پنجی قمیص۔ اور شلوار بہت پسند کرتے تھے اس کے علاوہ کبھی کبھی سوٹ یعنی کوٹ پتلون بھی زیب تن فرما لیتے تھے۔ جب کبھی مکان پر لوگوں نے دیکھا تو یہ دیکھا کہ یا تو قمیص اور شلوار پہنے ہوئے ہیں یا تہبند بندھا ہوا ہے اور ایک سادہ سی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ قیمتی لباس بھی موجود رہتے تھے اور پہنتے بھی تھے۔ لیکن شاذ و نادر۔

حلیہ

آپ بھاری یعنے دوہرے جسم کے آدمی تھے۔ قد لمبا، کسرتی ڈیل ڈول، قوی مضبوط، سر بڑا جس سے عالی دماغی کا پتہ چلتا تھا۔ انگریزی بال جن کو والہانہ انداز سے ہمیشہ کنگھے سے آپ اوپر کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی۔ گھنی بھویں درمیانی آنکھیں۔ ناک چہرے کی مناسبت سے نہ چھوٹی نہ بڑی، داڑھی۔ منڈواتے تھے۔ مونچھیں تھیں اور بھری ہوئی تھیں لیکن اتنی نہیں کہ ان کو اوپر چڑھاتے۔ بھری بھری گردن۔ گندمی رنگ۔"

ذوق شعر گوئی اور ڈاکٹر اقبال

مادۂ موزنیت آپ کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ اور آپ فطرتی اور قدرتی شاعر تھے۔ نو عمری سے ہی شعر و شاعری کی طرف طبیعت کا رُجحان تھا۔ بچپن میں آپ اکثر فقرے ایسے بول جاتے تھے۔ جو کسی نہ کسی بحر اور وزن میں ہوتے تھے۔ اس کے بعد اسکول میں اکثر چھوٹی چھوٹی غزلیں کہا کرتے تھے اور ان کو کسی قابل نہ سمجھ کر پھاڑ کر پھینک دیا کرتے تھے۔

لیکن اس کے بعد جب آپ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ تو وہاں اتفاق سے مولوی سید میر حسن صاحب سیالکوٹی جیسا باعلم اور شاعر مزاج استاد ملا۔ اس سے قبل بھی تذکرہ میں آچکا ہے کہ شاعری کی صحیح تحریک آپ کے دل میں مولوی سید میر حسن صاحب کے فیضان صحبت ہی سے ہوئی اور یہی آپ کے فن شعر گوئی میں استاد اوّل تھے۔ ڈاکٹر اقبال نے ابتدائی زمانہ میں مولوی صاحب موصوف سے ہی اصلاح لی ہے لیکن کالج کے زمانہ میں آپ نے جو کچھ کہا وہ زینت نوٹ بک فرماتے رہے۔

مولوی سیّد میر حسن صاحب نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ بیٹا اقبال اگر تمہارا ذوق شعر گوئی اس ہی طرح قائم رہا۔ تو آئندہ چل کر تم ایک مایۂ ناز شاعروں میں شمار کئے جاؤگے۔

آپ کو غزل گوئی سے زیادہ نظم گوئی اور وہ بھی قومی نظم کہنے کا شوق بہت زیادہ تھا۔ اور آپ نے شاعری کو ہی مذہب وملت کی خدمت کرنے کا بہترین ذریعہ خیال کیا تھا اور اس خیال کو پورا کر دکھایا۔

ڈاکٹر اقبال کو سیالکوٹ کے کالج میں اگر دلچسپی تھی۔ تو مولوی سید میر حسن صاحب سے ہی۔ آپ کا وقت کالج کے اوقات کے علاوہ مولوی صاحب ہی کی خدمت میں گزرتا تھا۔ آپ کو مولوی

صاحب سے بے انتہا محبت اور قلبی لگاؤ تھا اور مرتے دم تک آپ کو نہیں بھولے مولوی صاحب کو شمس العلماء کا خطاب صرف ڈاکٹر اقبالؔ کی ہی وجہ سے ملا جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد جب ۱۸۹۵ء میں آپ لاہور تشریف لے گئے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے تو مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے اور وہاں شاعر کی حیثیت سے روشناس ہوئے۔

لاہور کے ایک مشاعرہ میں جس میں حضرت ارشد گورگانی بھی شریک تھے۔ آپ تشریف لے گئے۔ جس میں آپ کی غزل اس قدر مقبول ہوئی کہ حاصل مشاعرہ مانی گئی۔ ارشد صاحب نے بھی آپ کو بہت داد دی اور آپ کے متعلق وہی پیشینگوئی کی جو مولوی سید میر حسن صاحب فرما چکے تھے۔

شاعر کی حیثیت سے آپ کی شہرت میں اضافہ "انجمن حمایت الاسلام" لاہور کے سالانہ اجلاس ۱۸۹۹ء میں نظم پڑھنے سے ہوا۔

"انجمن حمایت الاسلام" لاہور اس وقت مذہبی و قومی مباحث کا بہت بڑا مرکز تھی۔ جہاں قوم کی اصلاح کے لئے بہتر سے بہتر پروگرام بنائے جاتے تھے۔

زمانۂ ماضی کی طرح قوم کے جذبات اور احساسات کو ابھارنے کے لئے اس کو بھی ایک ایسے شاعر کی ضرورت تھی کہ جو مسلمانوں کے دلوں میں ایک نئی روح پھونک دے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں اس کا سالانہ

اجلاس ہوا جس میں ڈاکٹر اقبال نے ایک معرکتہ الآرا نظم "نالۂ یتیم" کے نام سے پڑھی یہ نظموں میں شاید سب سے پہلی نظم تھی جو آپ نے قوم کے سامنے پیش کی۔ نظم فن شعرگوئی اور جذبات لطیف سے پُر اور آوازیں سوز و گداز۔ پڑھی اور بلند آہنگی سے پڑھی۔ مقبول ہوئی اور ایسی مقبول ہوئی۔ کہ ہندوستان کے ہر علمی طبقہ میں اس کا ذکر ہونے لگا۔ اور لوگ اشتیاق میں رہنے لگے۔ کہ کب اقبال کسی جلسہ میں پڑھیں اور ہم سنیں۔ آپ کی نظم کی مقبولیت اور عمدگی کو دیکھکر اراکین انجمن حمایت الاسلام نے ڈاکٹر اقبال سے درخواست کی کہ ہر سال سالانہ جلسے میں آپ اپنی ایک نظم پڑھا کریں چنانچہ آپ نے وعدہ فرمالیا۔ اور ہر سالانہ جلسے میں آپ نے اپنی ایک نو تصنیف نظم پڑھی۔ اور ہر سال کامیابی کا سہرا آپ کے سر رہا ہر سال داد حاصل کی اور آئندہ کے لئے دلوں میں اشتیاق پیدا کر دیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۱ء میں جب جنگ بلقان اور طرابلس نے روز پکڑا تو ہندوستان کی رگِ حمیت اور جوش قومی نے جھرجھری لی۔ چنانچہ علامہ اقبال سے بھی نہ رہا گیا اور آپ نے بھی اپنی کیفیات دلی، اور جذبات قومی کا اظہار کرنے کے لئے ایک نظم پڑھی جس کی سرخی "خونی شہدا کی نذر" تھی۔ اس نظم نے آپ کو اس قدر ابھارا۔ اور چمکایا۔ کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں قومی شاعر کی حیثیت سے پکارے جانے لگے اور اہل ملک و قوم نے یہ سمجھ لیا کہ قومی شاعر اس کا نام ہے۔

ولایت کے قیام میں جو آپ نے وہاں سے سبق حاصل کیا وہ یہ تھا کہ وہاں کے طرز شعر گوئی کو ذہن میں محفوظ کیا۔ شاعری کا جو صحیح طریقہ ہے اور جو اظہار تاثرات کا انگریزی عنوان ہے اس کو خیال میں رکھا۔ اور ہندوستان آکر وہی طریقہ خود اختیار کیا ہندوستان اور ایران کا رنگ قدیم، گل و بلبل شمع و پروانہ کا شاعری میں استعمال اور جزو شاعری ہونا اپنی شعر گوئی میں ناجائز قرار دیا اور اس سے بچ کر ایک ایسی راہ اختیار کی جس نے آپ کو ماضی سے زیادہ سراہا اور تمام عمر سراہا۔ تمام عمر کیا بلکہ اب تک سراہ رہی ہے اور نہ معلوم کب تک سراہتی رہے گی۔

سر کا خطاب

اعیان سلطنت کو ۱۹۰۱ء میں ہی اقبال کا تعارف حاصل ہو گیا تھا جب کہ آپ نے ملکۂ وکٹوریہ کے انتقال پر ایک تعزیتی نظم ترکیب بند کی صورت میں لکھی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں یورپ کے دوران قیام میں ان لیکچروں سے آپ کی قابلیت کا اور بھی احساس حکومت کو ہو گیا جو آپ نے وہاں دیئے تھے۔ تمام یورپ میں علمی حلقوں میں آپ کے چرچے ہونے لگے۔ اور آپ کا کافی اثر اہل یورپ پر ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے وائسرائے صاحب بہادر کی شان میں

ایک قصیدہ تصنیف فرمایا جس کو وائسرائے صاحب بہادر نے بہت
پسند فرمایا جس سے تمام سرکاری شعبوں میں آپ کی حیثیت قائم ہو گئی
ابھی کچھ دن نہ گذرے تھے۔ کہ آپ نے ایک نظم جنگ یورپ
پر ایسی لکھی جس میں آپ نے اپنی قابلیت کے خوب خوب جوہر دکھائے
اس طرح آپ قوم کے ساتھ ساتھ حکومت کی نظر میں ممتاز صاحب
وقعت اور اہل کمال مانے جانے لگے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۲۲ء میں
بلا کوشش وطلب کے حکومت نے آپ کو سر کا خطاب عطا فرمایا۔

مولوی میر حسن صاحب اور خطاب

ڈاکٹر اقبال جیسا انسان بھی شاید دنیا میں پیدا نہ ہوا ہو مولوی
صاحب موصوف کی محبت اور وقعت آپ کی نگاہوں میں ہر وقت
اور ہر لمحہ جوش زن رہتی تھی جس وقت آپ کو شاعری کے سلسلہ
میں کوئی نمایاں وقعت ہوتی تھی تو اس وقت آپ اپنے ان مربی
کو ضرور یاد کر لیا کرتے تھے چنانچہ جس وقت آپ کو معلوم ہوا کہ
حکومت مجھکو خطاب دینا چاہتی ہے تو یہ خیال کرتے ہوئے کہ جس شخص سے
وہ شے حاصل کی ہے جس کی بنا پر مجھہ کو خطاب مل رہا ہے مجھ سے پہلے
اس کو خطاب ملنا چاہیئے۔ آپ نے حکومت سے کہہ دیا کہ میں اسوقت
تک کوئی خطاب نہیں لینا چاہتا جب تک میرے استاد مولوی

امیر حسن صاحب سیالکوٹی کو خطاب نہ عطا ہو جن کی بدولت اس وقت میں اس قابل ہوں کہ حکومت مجھ کو خطاب دینا چاہتی ہے چنانچہ حکومت نے آپ کی یہ ضد پوری کی اور مولوی صاحب موصوف کو شمس العلماء کا خطاب دیا۔

ڈاکٹر اقبالؒ کے فن شعر گوئی میں اُستادِ دُوئم

مرزا داغ دہلوی

جب سے ڈاکٹر اقبال نے سیال کوٹ چھوڑا اور مشن کالج سے گورنمنٹ کالج لاہور آئے جب سے مولوی سید میر حسن صاحب کی صحبت کو ترس گئے۔ اور کچھ اس قسم کے ماحول میں پھنس گئے۔ کہ آپ کو مولوی صاحب موصوف سے اصلاح لینے کا موقع نہ ملا۔ ملک میں اس وقت فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کی استادی کا چرچا تھا چنانچہ آپ نے بھی رسمی طور پر پہلے شعراء ہند و ایران کی طرح شاگردی اور استادی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے مرزا صاحب موصوف کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اور اردو کلام پر آپ سے ہی اصلاح لی۔ کیونکہ اس دور میں اردو زبان پر بلحاظ زبان جو قدرت آپ کو حاصل تھی وہ کسی اور کو میسر نہ تھی ڈاکٹر اقبال نے آپ کی شاگردی کا اعتراف اپنی اکثر نظموں میں کیا ہے۔

چنانچہ ایک جگہ اپنے ایک مقطع میں ایک مصرعہ فرمایا ہے ۔ ع

مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

لیکن باوجود آپ کی شاگردی کے آپ نے اپنے رنگ کو نہیں چھوڑا۔ آپ نے اُردو شاعری میں جن جن باتوں سے گریز کرنا خیال کر لیا تھا۔ ان سے گریز ہی کیا۔ اور مرزا صاحب نے بھی یہ خیال کر کے کہ شاگرد، شاگرد ہے اور اس کو بتانے کی ضرورت نہیں اور نہ اس کو پوچھنے کی کچھ حاجت اس لئے کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اقبال خود رَو طریقے سے جو کچھ کر رہا ہے اس کو کرنے دینا چاہیئے۔ اس طریقہ سے یہ کچھ کر جائے گا۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ اس کو اپنے ڈھنگ پر لانے کے بجائے اسکے طریقہ سے بھی کھو دیا جائے۔ سوائے اس کے کہ اگر فنی کوئی غلطی ہوئی تو نکال دی اور بس۔

شاعری میں ڈاکٹر اقبال کے استاد دوم

مولانا گرامیؔ جالندھری

جب تک آپ نے صرف اردو شاعری کی حضرت داغ دہلوی سے اصلاح لیتے رہے لیکن جب سے طبیعت کا رجحان فارسی شاعری کی طرف ہوا۔ آپ کو ایک فارسی گو استاد کی ضرورت محسوس ہونے لگی چنانچہ جالندھر کے ایک مشہور و معروف فارسی گو استاد مولانا گرامیؔ

کی خدمت میں پہونچے اور درخواست کی کہ قبلہ کمترین شرف غلامی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مولانا موصوف نے اقبال کا نام سنا تھا دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ آج دیکھ بھی لیا مل کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میاں میں جس قابل ہوں تمہارے واسطے ہر وقت موجود ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹر اقبال نے فارسی کلام کے سلسلہ میں جناب مولانا سے استفادہ حاصل کیا۔

گرامی صاحب ڈاکٹر اقبال سے بہت خوش تھے۔ اور بہت محبت سے اصلاح دیتے تھے۔ مولانا موصوف کو ناز تھا کہ اقبال جیسا ہونہار شاگرد ان کو ملا۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں۔ کہ استاد پر شاگرد کو فخر ہوتا ہے کہ میں فلاں کا شاگرد ہوں۔ لیکن یہاں اس کے برعکس استاد کو ناز تھا کہ میرا ایسا شاگرد ہے اور میں ایسے شاگرد کا استاد ہوں۔ مولانا ان کی شاعری اور طرز شاعری سے بہت خوش تھے۔ جب کبھی ڈاکٹر اقبال آپ کے پاس کچھ کہہ کرلے جاتے اور اس کو مولانا ملاحظہ فرماتے تو ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ کہ اقبال تمہارا کلام بعض وقت میرے کلام سے بلند اور بالاتر ہوتا ہے تم بہت ٹھوس اور پرمغز کہتے ہو اصلاح کی گنجائش نہیں۔ ڈاکٹر اقبال اسرار کرتے تھے کہ مولانا میں حضور کا غلام ہوں آپ کیوں مجھے شرمندہ فرماتے ہیں آپ میں جو خوبیاں ہیں ان کو کوئی میرے دل سے پوچھے اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ آپ کی چوکھٹ کے ایک اقبال ہی کیا سیکڑوں مرید ہیں۔ اور میرا کلام ہی کیا ہے اگر میرا کلام اصلاح کی قابل نہ ہوتا تو میں حضور والا کو تکلیف ہی کیوں دیتا۔ ابھی تو میں برسوں کوشش کروں گا اور مشق بڑھاؤں گا۔

اور صلاحیت کا اختتام ہو جائے گا آپ کا سایہ چاہتا ہوں۔ یہ سب کچھ آپ ہی کا دیا ہوا ہے جس کی بدولت آج مجھ کو ایک دو آدمی نظر میں لے آتا ہے۔

مولانا گرامی جالندہری

مولانا ایک خوش وضع اور خوش طبع بزرگ تھے آپ کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہی بخوبی ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر جیسے بلند خیال اور قابل انسان کے فارسی کلام کے استاد تھے۔ آپ کا کلام زیادہ تر فارسی میں ہی ہے وہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ جو چاشنی مجھ کو فارسی زبان میں ملتی ہے کسی اور زبان میں نہیں ملتی اردو شاعری جب تک کرتے رہے کرتے رہے۔ لیکن جب سے فارسی کہنا شروع کیا تو اردو کلام سے نفرت سی فرمانے لگے۔ اور فارسی کلام کی زیادتی شروع ہو گئی۔ آپ کا فارسی کلام بہت فصاحت و بلاغت سے پر ہوتا تھا اور ایرانی اور شیرازی انداز آپ کے کلام سے ٹپکتا تھا۔ سننے اور سمجھنے والے بہت محفوظ ہوتے تھے۔ آپ کے کلام کو کافی مقبولیت حاصل تھی آپ کا کلام اغلاط سے پاک ہوتا تھا۔ اور جذبات و کیفیات سے پر۔ جس کی قدر کچھ ڈاکٹر اقبال ہی خوب کرتے تھے اور مولانا بھی آپ کو اس کا قدر دان اور پرکھنے والا خیال کر کے خصوصیت سے سنایا کرتے تھے۔ اب ایسے صاحب کمال انسان کب پیدا ہوتے ہیں۔
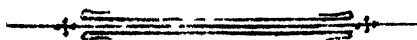
مولانا گرامی کی شاگرد نوازی

مولانا گرامی کے کم و بیش سو شاگرد تھے جو شاگرد کہلانے کے مستحق تھے اور جن کو شاگرد کہا جا سکتا تھا۔ لیکن ان میں جو شرف امتیاز اقبال کو حاصل تھا وہ کسی دوسرے کو نہ تھا حالانکہ آپ کبھی کبھی جاتے تھے۔

مولانا یوں تو ویسے ہی بہت با اخلاق آدمی تھے۔ لیکن شاگردوں کے سلسلہ میں وہ اپنے شاگردوں سے بالکل حقیقی بیٹوں جیسا برتاؤ فرماتے تھے۔ اکثر شاگردوں کو اس بات پر توجہ دلاتے تھے کہ وہ جو کچھ کہیں اس قابل کہیں کہ مجھ کو قلم لگانے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ لیکن وہ اگر ایسا کر سکتے تو شاگرد ہی کیوں ہوتے۔ لیکن اس کے بعد موصوف ہر شاگرد کی اصلاح میں اپنی کوشش سے کوئی نہ کوئی بات اس کے کلام میں ایسی پیدا کر دیتے تھے جس سے کلام کہیں کا کہیں پہونچ جاتا تھا۔ لیکن جب سے اقبال نے شاگردی اختیار کی اور آپ کے کلام کو دیکھا تو اپنے ایک شاگرد کو بھی اس قابل نہ پایا کہ اقبال کے ہم پلہ ہو سکے۔ اس کے بعد وہ اپنے تمام شاگردوں کے سامنے اقبال کی بلند خیالی اور شاعری کو مثال میں پیش کیا کرتے تھے۔
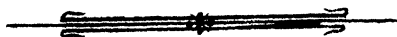
عالیجناب علامہ عبد العلی صاحب ہروی ایرانی مدظلہ

اور

ڈاکٹر اقبال

حضرت علامہ عبد العلی صاحب ہروی ایرانی مجتہد مرحوم ایران کے علماء میں سے ایک جید عالم تھے۔ آپ ایران ہی کے ساکن تھے اور ایران ہی میں تعلیم پاکر اجتہاد کی سند حاصل کی اجتہاد پاس کر کے ایران سے ہندوستان تشریف لائے اور ہندوستان کو گو نہ پسند فرمایا اور ہندوستان میں نسبتاً تمام جگہوں سے لاہور کی زیادہ تعریف فرمائی یہاں کی فضاء آپ کو اس قدر بھلی معلوم ہوئی۔ کہ کئی کئی ماہ مسلسل آپ لاہور رہنے لگے اور کچھ بعد آپ کا یہ معمول ہو گیا کہ سال میں چھ ماہ ایران رہنے لگے اور چھ ماہ ہندوستان اور ہندوستان میں جائے قیام لاہور ہی کو بنایا۔

آپ کی قابلیت آپ کی علم دوستی آپ کا علمی وقار لوگوں کے دلوں میں کچھ کم نہ تھا ڈاکٹر اقبال کو معلوم ہوا آپ بھی خدمت میں پہونچے اور نیاز حاصل کیا۔ ملاقات کامیاب ثابت ہوئی ڈاکٹر اقبال کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا قبلہ نے ڈاکٹر اقبال کو ان کی

فارسی قابلیت کی وجہ سے اپنے ہندوستانی مصاحبین میں شمار کر لیا حقیقت میں ڈاکٹر اقبال کو یہ ایک عجیب و غریب ہستی ہاتھ آگئی تھی ان سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا تھا اور اقبال نے حاصل بھی کیا۔ ڈاکٹر اقبال مولانا قبلہ کی خدمت میں آپ کے چھ ماہ کے قیام میں روزانہ چھ چھ اور سات سات گھنٹے رہتے تھے اور استفادہ حاصل کرتے تھے۔ اس دریائے علم سے جو کچھ بھی ڈاکٹر اقبال حاصل کر سکے کیا اور وہ کچھ کیا جو ایک ہندوستانی عالم سے حاصل نہ ہوسکتا تھا۔ مولانا قبلہ نے بھی اپنی حیات تک ڈاکٹر اقبال کو نوازا اور اپنی علمی روح ڈاکٹر اقبال کے جسد میں پہونچاتے رہے آپ ہر سال چھ ماہ کے لئے لاہور آتے رہے۔ اور اقبال کو اقبال بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال سے ڈاکٹر اقبال بن کر رہے قدرت ڈاکٹر اقبال کا ساتھ دے رہی تھی۔ ڈاکٹر اقبال کو جو بھی ملا وہ خوش قسمتی سے ایسا ہی ملا کہ جسنے ڈاکٹر اقبال کے لئے خود کو وقف کر دیا اور اپنے سینے سے تمام و کمال علوم ڈاکٹر اقبال کے سینے میں بھر دیئے۔ لیکن ڈاکٹر اقبال جیسا بھی علم کو جذب کرنے والا دنیا میں شاید ہی کوئی انسان پیدا ہو گا۔ جس شخص سے جو کچھ بھی ایک مرتبہ سن لیا وہ ہی لوح دل پر نقش ہو گیا۔
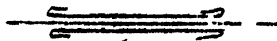
حضرت مولانا محسن علی صاحب سبزواری

اور

ڈاکٹر اقبال

حضرت مولانا محسن علی صاحب قبلہ سبزواری کی ذات عالی سے بھی ڈاکٹر اقبال کو نسبت ہے اور کافی نسبت آپ کی ذات مقدسہ سے بھی ڈاکٹر نے بہت کچھ حاصل کیا آپ کی قریب قریب تمام زندگی علماء اور فضلاء میں گذری آپ ہر عالم کے دل میں جگہ قائم کر لیتے تھے مولانا محسن علی صاحب قبلہ لاہور ہی کے رہنے والے تھے اور اقبال سے بہت محبت کرتے تھے اگر ڈاکٹر اقبال دو چار روز بھی آپ کے یہاں نہ جاتے تھے تو مولانا موصوف اپنا آدمی بھیج کر آپ کو بلوایا کرتے تھے۔ اور نہ آنے کی شکایت کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر اقبال اور ادب

اُردو

ڈاکٹر اقبال کو جو اُردو ادب سے نسبت ہے وہ اظہر المنشمس ہے

کون اس بات سے واقف نہیں کہ ڈاکٹر اقبال کی زبان اردو تھی۔ ہر مسلمان کے بچے کی ابتدائی تعلیم اردو ہی سے ہوتی ہے اور اس کے بعد دوسری زبان کی طرف توجہ کی جاتی ہے چنانچہ ڈاکٹر اقبال نے بھی سب سے پہلے اردو کا مطالعہ کیا۔ اور کماحقہٗ مطالعہ کیا۔

ڈاکٹر اقبال کی اردو، اعلیٰ اور بلند پایہ تھی آپ نے اردو حاصل کرنے کے بعد اردو میں جو تصانیف کی ہیں وہ اردو ادب پر ایک احسان ہے آپ کی تصانیف بہت پر مغز اور فلسفیانہ ہیں۔ کاش ڈاکٹر اقبال دو چار تصانیف اردو میں اور فرماتے لیکن زمانہ نے ساتھ نہ دیا۔ اور معدودے چند کتابیں اردو میں تصنیف فرما سکے۔ اس کے بعد آپ نے فارسی میں تصنیف کی۔۔۔

فارسی

اردو کے بعد ڈاکٹر اقبال کو جس زبان سے واسطہ اور سابقہ پڑا وہ فارسی زبان تھی آپ نے مولوی میر حسن صاحب سے فارسی حاصل کی اور مولانا موصوف نے بھی آپ کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے اپنی پوری قوت صرف کردی تھی مولانا موصوف کے بعد آپ نے خود فارسی کا مطالعہ کیا اور فارسی ادب اور تاریخ پر وہ عبور حاصل کیا کہ بعد میں خود اپنا ایک پرشین لٹریچر قائم کر دیا۔ اور اردو سے زیادہ

فارسی زبان میں آپ نے نثر و نظم تصنیفات فرمائیں۔ اور ایسی معرکتہ الآرا تصانیف فرمائیں کہ جس کے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے فارسی کی بہترین قابلیت درکار ہے۔ جس کی تفصیل آپ کی فہرست تصانیف کے سلسلہ میں آئندہ آئے گی۔ بہرحال آپ نے فارسی پر کافی قدرت حاصل کرلی تھی۔ اور اس سے بہتر سے بہتر فائدہ اُٹھایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ فارسی زبان نغموں سے پُر ہے۔ جس کی بنا پر مجھ کو پسند ہے۔

انگریزی

ڈاکٹر اقبال کے لئے انگریزی کے متعلق کچھ کہنا بیکار سا ہی ہے اسلئے کہ دنیا کو معلوم ہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی انگریزی تعلیم مکمل تھی۔ اور جس کا تذکرہ بالترتیب آچکا ہے آپ انٹرنس پاس کرکے کالج میں سیالکوٹ داخل ہوئے اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے۔ بی اے اور ایم اے کا امتحان دیا بعدہٗ ولایت شریف لے گئے اور وہاں سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری اور بیرسٹری حاصل کرکے لاہور آئے یہ تمام باتیں آپ کی انگریزی قابلیت کی شاہد عادل ہیں آپ نے انگریزی زبان میں اکثر و بیشتر بڑے۔ بڑے پرزور اور مدلل لیکچر دئے ہیں اور لاہور میں بہت کافی عرصہ تک بیرسٹری کی ہے۔ جو کامیاب بیرسٹری تھی۔ آپ انگریزی کو بالکل مادری زبان کی طرح لکھتے پڑھتے

اور بولتے تھے۔ بہرحال انگریزی میں آپ کو اس قدر قدرت حاصل تھی جو اتنے ڈپلوموں والے میں ہونی چاہیئے۔

ڈاکٹر اقبال کا مطالعہ

آپ کا مطالعہ اردو فارسی۔ عربی انگریزی ہر زبان میں، ادب تاریخ و مذہب فلسفہ، اور سیاست میں بہت کافی وسیع تھا۔ اسی مطالعہ پر کماحقہ، عبور رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کی جملہ تصانیف انہیں پانچ موضوعات کے بہترین جذبات کا نچوڑ ہیں۔ جو اب دوسروں کے لئے اک بہترین درس اور روشن ترین مشعل راہ ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنے مطالعہ سے جو کام لیا ہے وہ اپنی تصانیف میں پر کر دیا ہے۔ اور ان تصانیف کے مطالعہ سے دنیا فیضیاب ہو رہی ہے اور رہتی دنیا تک ہوتی رہے گی۔

آپ کی تصانیف کے لئے قابل دماغوں کی ضرورت ہے جو مکمل ان کو پڑھ کر مطلب نکال سکیں۔ صحیح سمجھ سکیں۔ آپ نے اپنی تمام نثر و نظم علم فلسفہ کے ماتحت رکھی ہے۔ چونکہ آپ نے علم فلسفہ میں کافی قابلیت حاصل کی تھی۔ آپ اک بہترین فلاسفر تھے۔ جس کی وجہ سے آپ کو علامہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

علّامہ کا لقب

تخلّص۔ خطاب۔ لقب یہ سب چیزیں اپنے اپنے مقام پر علیحدہ علیحدہ ہیں۔ تخلّص تو اس کہتے ہیں کہ جو شاعر خود اپنے لئے ایک چھوٹا سا نام اپنی نظموں میں استعمال کرنے کیلئے رکھ لیتا ہے خطاب وہ کہا جاتا ہے کہ جو بادشاہ یا سلطنت کسی اعزاز میں خوش ہو کر اپنی رعایا میں سے کسی کو دیتی ہے لقب اُس کو کہتے ہیں کہ جو انسان کی کسی صفت کے لحاظ سے شہر یا ملک والے کوئی مخصوص لفظ سے کسی کو پکارنے لگے ہوں۔ عرفیت اس کو کہا جاتا ہے کہ جو نام کے علاوہ ماں باپ یا دوست احباب پیار و محبت میں چھوٹا سا نام رکھ لیتے ہیں۔

چنانچہ علامہ بھی ڈاکٹر اقبال کا وہ ادبی لقب ہے یا وہ اعزازی ڈگری ہے جو آپ کی قابلیت کے صلہ میں اہلِ ملک اور اہلِ ادب نے آپ کو عنایت کی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت حقیقتاً لفظ علامہ کی مالک اور جائز مالک تھی۔ متذکرہ بالا قابلیتوں کا حامل واقعی علامہ سے کم نہیں ہو سکتا دنیا نے آپ کی قابلیت کا احساس کیا اور احساس بھی احساسِ حقیقی۔ چنانچہ آپ کو علامہ کے

علامہ سے پکارا گیا۔ اور اہل ادب نے آپ کو علامہ تسلیم کیا۔ اور کیوں نہ تسلیم کرتے آپ نے اپنے علم اور زود قلم کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ جس موضوع پر قلم اٹھایا جس موضوع پر بحث کی اس کو آئینہ کر دکھایا۔

ڈاکٹر اقبال کی فطری خصوصیات

ڈاکٹر اقبال صاف باطن اور با محبت انسان تھے۔ ہر چھوٹے بڑے امیر غریب، دوست دشمن سے یکساں ملتے تھے۔ بلکہ دیکھنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں۔ کہ آپ بہ نسبت بزرگ کے خورد سے زیادہ محبت اور انس سے ملتے تھے۔ بہ نسبت سرمایہ دار کے مزدور اور غریب کی زیادہ حمایت لیتے تھے۔ بہ نسبت دوستوں کے دشمنوں کو زیادہ سراہتے تھے زیادہ تواضع سے پیش آتے تھے۔

خود کو انتہائی حقیر اور ناچیز خیال کرتے تھے۔ دوسرے ہر شخص کی عزت کرتے تھے۔ خود علم دوست تھے اور علم دوست انسان کو اپنے دل میں بہت جگہ دیتے تھے۔ اور اس کی کافی حرمت کرتے تھے۔ کسی کو برا کہنا نہ جانتے تھے۔ زمانہ موجودہ کے شعراء کی اک یہ عادت ثانیہ ہو گئی کہ ایک شاعر دوسرے کو برا کہتا ہے اور اپنے سامنے دوسرے کو نظر میں نہیں لاتا۔ لیکن اقبال اس عادت سے مبرا تھے اور خود کو کچھ خیال نہ کرتے تھے، اور دوسروں کی ہمیشہ عزت کرتے تھے۔ آپ بے کے

بہت سے ہم نوالہ وہم پیالہ احباب اس بات کے شاہد ہیں کہ اقبال کو ہمنے کسی کی غیبت کرتے نہیں سنا۔ اگر کسی شخص سے آپ کو کوئی شکایت ہوتی تھی تو اس سے مل کر اس کی صفائی فرما لیتے تھے۔ اور دل کو شکوک سے پاک کر لیتے تھے۔

ڈاکٹر اقبال کی وضعداری

ڈاکٹر اقبال اپنی وضع کے قریب قریب بہت کافی پابند تھے بچپن یعنی زمانۂ تعلیم سے جس لباس کے عادی ہوئے آخر وقت تک اس کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ سفر یورپ بھی آپ کی وضع میں کوئی نمایاں فرق نہ پیدا کر سکا۔ آپ جس چیز سے رغبت کرتے تھے۔ آخر وقت تک رغبت کرتے رہے اور جس شے کو بُرا کہدیا تھا اس کو مرتے دم تک بُرا کہتے رہے۔ جس شخص سے جتنی راہ و رسم قائم ہو گئی۔ تمام عمر اس کو نباہا۔ آج ان کے دوست اور ملاقاتی ان کی ان خصوصیات کو یاد کر کر کے روتے ہیں۔ اور تلاش کرتے ہیں۔ لیکن اب اقبال ان کو نہیں مل سکتے اور دوسرے کسی شخص میں وہ اوصاف آ نہیں سکتے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کو اس کے مرنے کے بعد تک زندہ رکھتی ہیں اور اس کا نام لینے پر مجبور کرتی ہیں۔ اور اس کی زندگی کی مرنے کے بعد داد دلواتی ہیں۔

خواہش نام و نمود

ڈاکٹر اقبال کی حقیقتاً توہین ہے اگر کوئی شخص آپ کے متعلق یہ کہے کہ آپ میں مادۂ شہرت پسندی اور نام پروری تھا۔ آپ نے کبھی اپنی شہرت نہیں چاہی اور نہ یہ آپ کے قابو کی چیز تھی۔ یہ شئے رب العزت نے صرف اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت اور شہرت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے عزتی اور گمنامی کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے اور اہل دنیا کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جو لوگ خود کو مشہور کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ گمنامی اور تاریکی میں تمام عمر اس طرح پڑے رہتے ہیں۔ کہ ان کا کوئی نام تک بھی نہیں جانتا۔ اور خداوند عالم دکھاتا ہے کہ یہ چیز تمہارے اختیار میں نہیں ہے بلکہ میرے اختیار اور قبضۂ قدرت میں ہے۔

برخلاف اس کے جو لوگ خود کو خداوند عالم کی ذات پر چھوڑ دیتے ہیں اور اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کی مخلوق کی خدمت بلا کسی معاوضہ کے لالچ کے صرف اس کی محبت میں کرتے ہیں ان کو خود خدائے برحق بام عروج پر پہونچا دیتا ہے اور سربلندی اور سرفرازی دیتا ہے۔ اور ان کے سپرد کچھ اس قسم کی خدمتیں کو دیتا ہے۔ کہ جس کی بدولت وہ خلق اللہ کی نظروں میں بھی ممتاز درجہ کے مالک

ہو جاتے ہیں۔ قدرت نے ڈاکٹر اقبال سے جو کچھ کام لیا وہ دنیا پر روشن ہے قدرت نے آپ کا نام جتنا دنیا میں مشہور کیا وہ اہل عالم پر ظاہر ہے۔ اس میں آپ کا کیا دخل تھا۔ آپ اس سے بالکل لاتعلق تھے۔ آپ نے کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کا ثبوت اور بین ثبوت یہ ہے کہ جب آپ کو حکومت نے خطاب دینا چاہا۔ آپنے اس میں اس قسم کی باتیں پیدا کیں کہ اگر حکومت کو ذرا بھی ناگوار گزر جاتا تو تمام عمر آپ کو خطاب تو کیا کوئی اعزاز بھی سلطنت کی طرف سے نہ ملتا۔ وہ یہ کہ آپ نے جب سنا کہ مجھ کو حکومت خطاب دینا چاہتی ہے۔ تو آپ نے یہ شرط رکھ دی کہ مجھ سے پہلے میرے استاد کو خطاب دیا جائے

آپ نے اس وقت یہ خیال نہ کیا۔ کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں اور کس سے کہہ رہا ہوں۔ اگر حکومت کو ناگوار گزر جائے گا۔ تو کیا ہوگا استاد تو کیا خود کا خطاب بھی جائے گا۔ اور کف افسوس ملنا پڑے گا۔ لیکن کیوں خیال کرتے آپ جانتے تھے۔ کہ اگر قدرت کو منظور ہے تو یہ مجھکو بھی خطاب دیں اور استاد کو بھی اور اگر خدا کو ہی منظور نہیں ہے۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور زیادہ سے زیادہ بھی تو ہو گا کہ خطاب نہ ملے گا؟ نہ ملیگا نہ ملو"

اس سے ثابت ہوا کہ ڈاکٹر اقبال اس قسم کی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اور کچھ مستغنی سے تھے۔ اگر کوئی عزت ہوئی تو خدا کا شکر کیا۔ اس لئے کہ یہ خدا کی دین تھی۔ ورنہ اس کی رضا پر رضامند

رہے۔ وہ ایک مردِ آزاد بنے اور آزادانہ اپنا کام خلوص سے کرتے رہتے تھے۔ اور خدا کی خوشنودی چاہتے تھے۔ جو کچھ مانگتے تھے اس ہی سے مانگتے تھے۔ ہٹ کرکے مانگتے تھے۔ ضد کرکے مانگتے تھے۔ اور جو کچھ ملتا تھا وہیں سے ملتا تھا۔ اور اس ہی کے دئے ہوئے پر آپ مست رہتے تھے۔

عشق خدا اور رسولؐ

آپ سچے مسلمان کے بیٹے تھے خود بھی کٹر مسلمان تھے۔ آپ کی نظمیں گواہ اور شاہد عادل ہیں۔ آپ نے اکثر اپنی نظموں میں اس قسم کے مذہبی تیور دکھلائے ہیں جن سے عقیدت خداوندی اور الفت محمدی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی ایک مشہور و معروف غزل کا مطلع ہے جسے ڈاکٹر اقبال نے معرفت میں ڈوب کر کھا ہے۔ اور انداز بیان انوکھا اور نرالا۔ وھوا ہذا۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں ٭
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبیں نیاز میں

آپ فرماتے ہیں کہ اے وہ ذاتِ حقیقی کہ جس کا مجھ کو انتظار ہے۔ کبھی لباس مجاز میں بھی آجا۔ تاکہ میں تجھ کو اپنی مادی نگاہوں سے بھی دیکھ لوں ان ظاہری نظروں میں بھی اس نور کو اس نور پاک کو جذب کرلوں

اس لئے اور صرف اس لئے کہ میرے دل میں جذبۂ عبدیت جوش زن ہے
اک ولولہ ہے اور ولولۂ بندگی اک اُمنگ بنے اور اُمنگ بھی حقیقی محبت
کی میں چاہتا ہوں کہ اس پیکر نورانی سے بچ کر جس کو ہماری یہ ظاہری
نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں ظاہری حسن کی صورت میں کبھی ان ظاہری
نگاہوں کے سامنے بھی آ جا۔ اس لئے کہ ذوق پرستش مجھ کو بیتاب
کر رہا ہے۔ میری نیازمندی مجھ کو بے چین کر رہی ہے اور میری
جبین بندگی میں ہزاروں سجدہ ہائے نیازمندانہ ادا ہونے کیلئے
مضطرب ہیں۔ کہ کب تو نگاہوں کے سامنے نظر آئے اور کب وہ ادا
ہوں۔"

ڈاکٹر اقبال نے اس مطلع میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ ظاہر و باہر ہے
وہ اپنے جذبۂ محبت میں محو اور غرق ہو کر گم ہو کر پیار اور چاہت کے
انداز میں معشوق حقیقی کو مخاطب کر رہے ہیں۔ جس سے اک "خوشامدانہ"
ہٹ اور ضد کا انداز ٹپک رہا ہے۔ آپ مجبور ہیں اور جذبات کا
اظہار شعر کی صورت میں فرما رہے ہیں۔ کس قدر جاذبیت ہے کہ مطلع
دل کو اپنی طرف کھینچے لیتا ہے اور دل مطلع کو اپنے میں جذب کرنے
کو کہتا ہے۔ آپ کا زیادہ تر کلام اس ہی انداز کا ہے کبھی آپ شعر
کہتے وقت خداوند عالم کی واحدنیت اور اس کی محبت میں گم ہو کر رہ
گئے ہیں اور کبھی محمد و آل محمد کی الفت میں حل ہو گئے ہیں ان دونوں
جذبوں کے درمیان اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ کلام ہے۔ جس کو اسلامی

اور قومی شاعری کہتے ہیں۔ بہر حال آپ کا کلام صرف وہی کلام ہے جو
اک مسلمان کا کلام ہونا چاہیئے۔ کہیں خدا کی خدائی کے مناظر ہیں۔ تو کہیں
رسُول کی رسالت کے کارنامے۔ کہیں رسول کی رسالت کے کارنامے
ہیں تو کہیں آل محمدؐ کی پاکیزہ اور معجز نما داستانیں کہیں خالق کی مخلوق
نوازی ہے۔ تو کہیں رسول مقبول کی اسلام پروری کہیں رسُول کی
اسلام پروری ہے تو کہیں حیدری حملوں کی یاد۔ کہیں کربلا کے تپتے
ہوئے میدان میں رسول کی آل کے خون کا چھڑکاؤ دکھایا ہے۔ تو کہیں
نیک کاموں کے معاوضہ میں کوثر کے جام چھلکائے ہیں۔ غرض آپ
کا کلام گوناگوں لطافتوں کا مرکز اور مذہبی عنصر سے لبریز ہے جو انتہائی
بلند پر مغز اور ٹھوس ہے۔ جس کے لئے دماغ کی ضرورت ہے۔ اور
عالی دماغ کی۔

ڈاکٹر اقبال کی دنیاوی زندگی میں
دینی خدمت کی جھلک

آپ سنہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ممبر ہونے
کے بعد آپ نے جو کچھ کام کیا وہ سب غربا۔ اور پریشان حال لوگوں
کی بہبودی کے لئے کیا۔ مزدوروں اور کاشتکاروں کے لئے [illegible]

پروگرام بنائے۔ اور بنوائے۔ اور مسلمانوں کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے بہتر سے بہتر قانون تیار کرنے اور کرانے کی کوشش کی

سنہ ۱۹۲۸ء میں آپ مدراس تشریف لے گئے اور وہاں اسلام پر انتہائی پرمغز لیکچر دیا جو انتہائی کامیاب ثابت ہوا۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں آپ نے بنگلور، میسور اور حیدر آباد کا سفر کیا جہاں آپ کا بہت کامیاب خیر مقدم کیا گیا۔ آپ نے ان مقامات میں سے اکثر جگہوں پر قومی اور مذہبی اسلامی لیکچر دے اور نظمیں پڑھیں۔ اور ان سفروں میں مذہبی خدمت شامل کرکے ثواب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔"

سنہ ۱۹۳۰ء میں آپ نے مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کی صدارت فرمائی اور بہترین خطبۂ صدارت قوم کی خدمت میں پیش کیا۔ جس میں مذہبی اور قومی مفاد کی روشنی تھی۔

سنہ ۱۹۳۱ء و سنہ ۱۹۳۲ء میں انگلستان گول میز کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوئے جہاں اسلامی مفاد پر بحثیں فرمائیں اور اسلامی حقوق کو محفوظ کرنے کی تحریکیں کیں۔

بیرسٹری

آپ سنہ ۱۹۰۸ء میں لاہور تشریف لائے تھے اس کے بعد بیرسٹری شروع کر دی تھی اور تقریباً سنہ ۱۹۳۴ء تک اس مشغلہ کو جاری رکھا اس

کے بعد کچھ طبیعت خراب رہنے لگی اور بیرسٹری کو ترک کردیا۔

گورنمنٹ بھوپال اور اقبال

۱۹۳۵ء میں جس وقت ڈاکٹر اقبال کی زندگی اور وہ بھی ادبی زندگی کا شباب تھا فرمانروائے بھوپال نے آپ سے ملاقات فرمائی اور آپ کی علمی ادبی اور قومی وملی خدمات کے صلہ میں پانچ سو روپے ماہوار آپ کے مقرر فرمائے اور فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب جب تک آپ زندہ ہیں اس وقت تک ریاست بھوپال آپ کی یہ خدمت کرے گی۔ چنانچہ جب تک ڈاکٹر اقبال زندہ رہے بھوپال سے آپ کو برابر ۵۰۰ پانچسو روپیہ ماہوار ملتے رہے۔

ڈاکٹر اقبال کی اولاد

ڈاکٹر اقبال نے دو شادیاں کیں پہلی شریکۂ حیات اب تک زندہ ہیں۔ اور ان کے بطن سے ایک صاحبزادے آفتاب اقبال صاحب ہیں جو لاہور میں بیرسٹری فرماتے ہیں۔ دوسری شریکۂ حیات کا انتقال ہوگیا جن کے بطن سے ایک صاحبزادے جاوید اقبال صاحب اور ایک صاحبزادی ہیں۔ جو لاہور میں ہی رہتی ہیں جاوید صاحب کے لیے لاہو

میں ڈاکٹر اقبال نے ایک مکان تعمیر کرایا تھا جس کا نام بھی جاوید منزل ہے۔ جاوید صاحب اور آپکی ہمشیرہ صاحبہ جاوید منزل ہی میں رہتے ہیں۔ آپ جاوید صاحب اور آپکی ہمشیرہ صاحبہ سے بہت محبت فرماتے تھے

تصانیف

آپ کی اُردو، فارسی، انگریزی، ہر سہ زبان میں تصانیف موجود ہیں۔ جس زبان میں جو تصنیف ہے۔ وہ اپنا جواب آپ ہے۔ جتنی تصانیف کی تحقیق ہم کو ہوسکی وہ درج کرتے ہیں۔ اگر اس کے علاوہ بھی کوئی کتاب ہو تو ممکن ہے۔ ناممکن نہیں۔

(۱) شکوہ (اُردو) (۱۱) بال جبریل (اُردو)
(۲) جواب شکوہ (اُردو) (۱۲) ضرب کلیم (اُردو)
(۳) نالہ یتیم (اُردو) (۱۳) ارمغان حجاز (فارسی و اردو)
(۴) فریاد امت (اُردو) (۱۴) پیام مشرق (فارسی)
(۵) ترانہ (اُردو) (۱۵) زبور عجم (فارسی)
(۶) علم الاقتصاد (اُردو) (۱۶) جاوید نامہ (فارسی)
(۷) بانگ درا (اُردو) (۱۷) پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق
(۸) فلسفۂ عجم (ترجمہ) (فارسی)
(۹) اسرار خودی (فارسی) (۱۸) مسافر (فارسی)
(۱۰) رموز بے خودی (فارسی) (۱۹) خطبات مدراس (انگریزی)

مرض الموت

پیام اجل ہر امیر و غریب، شاہ، گدا، قابل و نا قابل۔ عالم و جاہل کے لئے آتا ہے اور آتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال کے لئے بھی آیا۔ موت برحق ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم جنس کی مفارقت کا ملال اور رنج بھی ہوتا ہے۔ اور خصوصاً با اوصاف ہمجنس جب جدا ہوتا ہے تو اس کا زیادہ رنج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال میں جو اوصاف اور جو خوبیاں تھیں وہ معمولی اور قابل فراموش نہ تھیں۔ لیکن رضائے الٰہی میں تاب دم زدن کس کو۔

"مرضئ مولا از ہمہ اولیٰ"

مرنے سے پہلے موت کا بہانہ قدرت کوئی نہ کوئی اس لئے پیدا کر دیا کرتی ہے کہ خود مرنے والا اور اس کے اعزار سمجھ جائیں کہ اس شخص کا وقت قریب ہے محبت کم کر دی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ صبر آجاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر اقبال کو بھی بہانۂ موت کی صورت میں مرض نے آدبایا۔ اور آپ نے محسوس فرمالیا کہ اب میں دنیا سے جانے والا ہوں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ کو مطلق ہراس نہ تھا اور نہ کسی مسلمان کو موت سے ڈرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر اقبال کو دل کی کمزوری کی شکایت تو عرصہ سے تھی اور کھانسی دمہ کا بھی دورہ اکثر پڑتا تھا لیکن کبھی کبھی، دوا وغیرہ استعمال فرماتے رہتے تھے۔ آرام ہو ہو جاتا تھا لیکن جب موت کا پیغام بن کر مرض آیا کرتا ہے تو کوئی دوا اثر نہیں کیا کرتی اور کوئی طبیب اس کو نہیں بچا سکتا۔ مشہور ضرب المثل ہے۔

"چوں قضا آید طبیب ابلہ شود"

۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال پر دمہ۔ کھانسی کا دورہ پڑا۔ اور شدید اور اتنا شدید کہ یہی پیام موت ثابت ہوا۔ علاج ہوا اور بہت کافی ڈاکٹر اقبال کے لئے طبیبوں اور ڈاکٹروں کی کمی نہ تھی آپ کے سیکڑوں طبیب اور ہزاروں ڈاکٹر دوست تھے۔ ایک نے نہیں بہت سے طبیبوں نے اور ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا جب حالت زیادہ بگڑی تو لاہور کے اک ڈاکٹروں کے بورڈ نے مل کر اجتماعی مشورہ سے علاج کیا۔ لیکن بے سود۔

آپ کی بیماری سے تمام لوگ بلا قید قوم و مذہب ہندو مسلمان متاثر تھے۔ عیادت کو ہر شخص آتا تھا۔ آپ نے فرمادیا کہ جو شخص خواہ وہ رئیس ہو یا غریب چھوٹا ہو یا بڑا آنے دیا جائے"۔

مرنے والے کو مرض الموت میں موت نظر آنے لگتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے۔ کہ میں نہیں بچوں گا۔ چنانچہ آپ کو بھی علم ہو گیا تھا۔ کہ اس مرتبہ میرا یہ دورہ مجھ کو نہیں چھوڑے گا۔ لیکن چہرے بشرے پر خوف

وہراس کے آثار مطلق نہ تھے۔

ہر شاعر اپنے مرنے سے پہلے ایک نہ ایک شعر اپنے مرنے کے سلسلہ میں ایسا کہہ جاتا ہے۔ جو آئندہ اس کے مرنے کے بعد زبان زد ہو جاتا ہے اور لوگ اس کے شعر کو اس کی یاد میں دہرایا کرتے ہیں جیسے ذوقؔ نے اپنے مرنے سے قبل کہا۔ کہ

سنتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

یا میر انیسؔ کا واقعہ مشہور ہے۔ کہ جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو لوگ عیادت کو آنے لگے۔ اس ہی سلسلہ میں آپ کے دوست اور فنی مدمقابل حضرت دبیرؔ بھی عیادت کو قریب قریب روزانہ ہی تشریف لاتے تھے۔ جب آپ کے مرض نے طول پکڑا اور حالت زیادہ خراب ہوئی۔ تو آپ نے احساس کر لیا کہ اب سفر آخرت درپیش ہے مرنے سے دو تین روز قبل مرزا دبیرؔ تشریف لائے۔ فرمانے لگے میر صاحب مزاج کیسا ہے۔ میر صاحب نے جواب میں فرمایا پیارے بھائی مزاج کیسا ہے۔ ؎

آخر ہے عمر زیست سے اب دل بھی ہے سیر

پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

اسی طرح ڈاکٹر اقبالؔ نے اپنی موت سے چند گھنٹے قبل ایک قطعہ فرمایا اور بلند آواز سے دہرایا۔ جس کی آواز قریب کے بیٹھے ہوئے

لوگوں نے بھی سُنی ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید * نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے * دگر دانائے راز آید کہ ناید

اس کے بعد آپ کی حالت میں ایک غیر معمولی تغیر محسوس ہونے لگا تھا"۔

رحلت

قطعہ مذکورہ کے پڑھنے کے بعد آپ چند گھنٹے ہی اور زندہ رہ سکے۔ ۶۲ سال اس دنیائے فانی میں فانی مسافروں کو درس فنا دے کر ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

انا اللہ وانا الیہ راجعون ؐ

آپ کی وفات کی خبر آناً فاناً شہر بھر میں اور اخباروں کے ذریعہ فوراً کے فوراً تمام ملک میں پہونچ گئی۔ اور تمام ہندوستان میں آپ کا غم منایا گیا۔ لاہور میں تمام کچہری اور دفاتر وغیرہ بند کردئے گئے۔ جاوید منزل ماتم داروں سے پر ہو گئی۔ تمام شہر میں آپ کی موت پر ماتم کیا گیا۔ قریب قریب ہر ادبی ادارہ میں صف ماتم بچھی۔ ہر انجمن۔ کلب اور ہر لائبریری میں ماتمی جلسے منعقد ہوئے اور آپ کی تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں شریک ہونے اور انتظام کرنے

کے رزو لیوشن پاس ہوئے۔ جنازہ کے جلوس کے انتظام ہوئے۔
اور شام کے ۵ بجے جنازہ جاوید منزل سے برآمد ہوا تین چار ہزار
افراد سے کم نہ تھے۔ جس وقت جنازہ برآمد ہوا ہے اس کے بعد جنازہ
انتہائی احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ تکبیر و تحلیل کے ساتھ بڑے بڑے
راستوں سے گزرتا ہوا شاہی مسجد تک پہونچا۔ جہاں نمازِ جنازہ ادا
ہوئی تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں پچاس ہزار مسلمانوں
سے کم نہ تھے۔ اور جنازہ کے ساتھ جتنے لوگ تھے۔ ان کی تعداد کا
اندازہ اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ صرف مسلمان ہی نہ تھے۔ بلکہ
جنازہ میں ہزاروں ہندو بھی شریک تھے۔ بہرحال نماز سے فارغ
ہوکر آپ کو شاہی مسجد کے قریب ہی سپردِ خاک کیا گیا۔

تمام اخباروں نے مدرسوں کالجوں نے لائبریریوں اور انجمنوں
نے مقامی اور غیر مقامی ملکی اور غیر ملکی غرض شہر شہر قصبہ قصبہ
ہر ادبی ادارہ نے ڈاکٹر اقبال کا غم منایا۔ اور نہ معلوم کب تک
مناتے رہیں گے۔ مہینوں ماتمی جلسے ہوتے رہے اور بہت سے قصبوں
اور شہروں میں ہر سال یوم اقبال (اقبال ڈے) اب تک منایا جاتا
ہے اور ان کے لئے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ ان کے حالاتِ
زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے ان کے درس سے استفادہ حاصل
کیا جاتا ہے۔ اور نہ معلوم کب تک کیا جاتا رہے گا۔

آپ کی وفات حسرت آیات پر اخباروں اور رسالوں میں اور

ہر جلسہ میں اور یوم اقبال میں جگہ جگہ ہر سال اَب تک ہزاروں مضامین، نظمیں، نوحے، مرثیے۔ اور قطعات تاریخ ادبی لوگوں نے لکھے ہیں۔ جن میں سے بہت سے اخباروں اور رسالوں میں طبع ہو گئے۔ اور زیادہ تعداد ایسی ہے جو جلسوں، اور محفلوں میں پڑھ کر اپنے پاس ہی محفوظ کر لیا اگر ہندوستان والوں سے یہ تمام مضامین نظم و نثر طلب کئے جائیں۔ تو ایک ضخیم کتاب علیحدہ مرتب ہو جائے۔ یہ آپ کی ہر دل عزیزی اور قابلیت کی بیّن دلیل ہے تمام عمر لوگ آپ کی ذات کو یاد رکھیں گے۔ اور ہزاروں سال تک آپ کی برسی مناتے رہیں گے۔ یوم اقبال قائم ہوتے رہیں گے۔ اور ان کی روح خوش ہوتی رہے گی کہ ہاں دنیا میں میرے نام لیوا ہیں۔ اور کتنے ہیں۔ قارئین کی ضیافت طبع کے سلسلہ میں چند حضرات کے مضامین اور چند شعراء کی نظمیں پیش کی جاتی ہیں۔

مضامین
نثر و نظم
بر وفات
علامہ سر محمد اقبال
مرحوم و مغفور

ملک کے

اہل قلم ادیبوں اور شاعروں نے جو نثر و نظم
کی صورت میں ڈاکٹر اقبال کی وفات حسرت
آیات پر اپنے اپنے دل کی ترجمانی کی ہے
وہ اس لئے ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہے۔ کہ ملک
و قوم کو معلوم ہو جائے کہ ڈاکٹر اقبال کس
قدر ہر دل عزیز اور بے پایاں شاعر تھے اور
ان کی موت سے ملک نے کیا اثر لیا۔

(مولف)

اقبالؔ کی زندگی پر

عالیجناب سید ارتضیٰ حسین صاحب بی۔ اے۔ کمال گانوی کے خیالات

جب کسی وجود کی زندگی کا ہم ذکر کرتے ہیں یا اس کے متعلق کچھ سوچتے ہیں۔ تو ہماری نظر اس کی زندگی کے محض اتنے حصہ پر پڑتی ہے۔ جو ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اور جس کا تعلق ہمارے معاشی نظام سے ہوتا ہے"۔

یوں تو انسان کی زندگی اس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب زبان قدرت سے لفظ "کن" صادر ہوا۔ اور اس کے تلفظ نے فضا میں تموج اور دائرۂ تخلیق کے محیط میں حرکت پیدا کی، انسان کی رُوح پیدا ہوئی، اور یکے بعد دیگرے اُن منازل کو طے کرنے لگی جو اس کے لئے خلّاق عالم نے مقرر فرمائے تھے۔ "کُن" سے شروع ہو کر یہ زندگی اس وقت ختم ہونے والی ہے۔ جب دفتر خلقت پہ کلُ من علیہا فان کی مہر ثبت ہو جائے گی اس طرح انسانی زندگی کا ایک مکمل دائرہ بنتا ہے جو "ک" اول سے شروع ہو کر "ن" آخر پر ختم ہوتا ہے، زندگی کا وہ حصہ جو انسان اپنے عنصری وجود کے ساتھ اس خاکدان عالم میں نظام عالم کی ایک کڑی بن کر گذارتا ہے مذکورۂ بالا دائرہ کا محض ایک چھوٹا سا قوس ہے، اس قوس کو دیکھکر

ہم کسی انسان کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں اور اسی عنصری زندگی کو دیکھ کر اس کی ان روحانی منزلوں کا اندازہ بھی لگا لیتے ہیں جن سے اس کی روح عالم وجود میں آنے سے پہلے گذری ہے اور اس جہان آب و گل سے رخصت ہونے کے بعد گذر سکتی ہے۔

علیٰ ہذ القیاس اقبال کی زندگی سے بھی ہماری مراد یہاں اس کی زندگی کا صرف وہ حصہ ہے جو اس نے اقبال کے نام کے ساتھ ہم میں گذاری۔ اس حصہ میں سے اگر ہم وہ چند ابتدائی سال نکال دیں۔ جنہیں دوسرے لفظوں میں لاابالی کا زمانہ یا بچپن کہتے ہیں تو اقبال کی پبلک لائف صحیح معنوں میں ۱۹۰۱ء سے شروع ہوئی ہے۔ جس سنہ کے اپریل میں رسالہ مخزن لاہور نے اس کی پہلی نظم "کوہ ہمالہ" سے خطاب شائع کر کے اُسے ادبی دنیا میں پہلی مرتبہ روشناس کرایا۔ اس کے بعد اقبال انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہو کر ہر سال ایک نئی نظم سناتے رہے اور شہرت کے منازل طے کرنے لگے "نالۂ یتیم" "تصویر درد" "شکوہ جواب شکوہ" "خضر راہ" انجمن مذکور کے مختلف اجلاسوں میں پڑھی گئیں اور پسند کی گئیں۔ انہیں نظموں نے جوہر شناس اور ادب نواز حضرات سے اقبال کو ترجمان حقیقت، اور قومی شاعر کے جیسے معزز ترین القاب دلائے۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اقبال یورپ میں رہے اور وہاں سے

فارسی گوئی کا جذبہ لے کر واپس آئے۔ اسرار خودی لکھی، جسکا ترجمہ ان کے قدر شناس استاد مسٹر ٹامس ارنلڈ نے زبان انگریزی میں شائع کیا جس نے اقبالؔ کو یورپ اور امریکہ کے علمی طبقوں میں روشناس کرایا۔"

۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء تک بہت تھوڑی اردو نظمیں ان کے قلم سے نکلیں اس زمانہ میں وہ بیشتر فارسی ہی میں کہتے رہے ہے" ہمارے سامنے ان کے اردو کلام کا مجموعہ بھی ہے۔ اور فارسی تصنیفات بھی ان دونوں چیزوں کو دیکھ کر ہم اقبال کو نہ محض اُردو کا شاعر کہہ سکتے ہیں، نہ محض فارسی کا، اقبال اگر شاعر تھا تو دونوں زبانوں کا قادر الکلام شاعر تھا۔"

لیکن اس کا پُر مغز کلام، اس کی چھوٹی چھوٹی سلیس اُردو عام فہم نظموں کے دامن کی معنوی وسعت دیکھ کر یہ کہنے جرأت بھی نہیں ہوتی۔ کہ وہ محض شاعر تھا، بلکہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ وہ شاعر کے علاوہ کچھ اور بھی تھا، وہ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب نہ اس کے کسی اُستاد کی رائے دے سکتی ہے نہ اس کے کسی ہمعصر کا تبصرہ، اگر صحیح معنوں میں اقبالؔ کو کوئی پیش کر سکتی ہے تو محض اس کا کلام ہے۔ جو اُردو۔ فارسی۔ نظموں اور نثروں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔"

اقبالؔ کی بعض نظمیں اور اس کے بعض علمی خطبے ہمیں یہ بتاتے

ہیں۔ کہ اقبال ایک فلسفی تھا۔ برخلاف اس کے بعض نظمیں، بعض تحریریں اور بعض تقریریں یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ ہمارے زمانہ کا ایک بہت بڑا ریفارمر تھا، یہی نہیں بلکہ اس کے کلام کا ایک نہایت روشن پہلو اسے اسلام کے ایک جوشیلے مبلغ کی حیثیت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے"

"حقیقت حال یہ ہے کہ اقبال شاعر بھی تھا، فلسفی بھی تھا۔ ریفارمر بھی تھا، اور مبلغ بھی تھا، اس نے اُردو اور فارسی ادب میں مفید اضافہ بھی کیا، فلسفہ کے دقیق مسائل کو زمانہ کے موجودہ رنگ میں حل بھی کیا، اور اپنے پراثر جذبات و فلسفیانہ کلام کے ذریعہ اسلام کے محاسن کی اشاعت بھی کی،

اس کے علمی اور ادبی کارناموں کو دیکھکر ہم سوائے اسکے کسی نتیجہ پر نہیں پہونچتے کہ اس کی رُوح نہایت اعلیٰ جوہر سے مالا مال تھی اور وجود عنصری میں آنے سے قبل نہایت اعلیٰ منازل سے گذر چکی تھی۔ نیز ان ہی نقوش کو دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم سے رخصت ہو کر اقبال اعلیٰ علیین کے مقام میں پہونچا جس کی تمنا ہم میں سے ہر ایک کو ہے اور ہونی چاہیئے"۔

سید مرتضیٰ حسین بلیغ نوگانوی

ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کی وفات پر

حضرت علامہ سیمابؔ اکبر آبادی کا پیام

آج میرے وطن میں میرے برادر خواجہ تاشؔ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ مرحوم کی بزم عزا قائم ہوئی ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ گلشن دہلی کا پروردہ رنگ و نوا، ایک بلبل آشفتہ سر خاک لاہور میں دفن کر دیا گیا۔"

جب مجھے ڈاکٹر اقبال کی رحلت کی اطلاع ہوئی تو مجھے اس عظیم سانحہ کا یقین نہ آیا اس لئے کہ ساعت اس غیر متوقعہ واقع کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی مگر پھر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اطلاع صحیح ہے اور ہماری مادی دنیا سے وہ مفکر شاعر روحانی دنیا میں منتقل ہو چکا ہے جس کی موت بھی غور و فکر کے لئے شعر کی سی کیفیت رکھتی تھی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے عزیزان وطن نے مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالنے کے لئے یہ جلسۂ عزا منعقد کیا ہے۔ اس قسم کے جلسوں سے قومی و مجلسی زندگی میں رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔

ڈاکٹر اقبالؔ مرزا داغؔ دہلوی مرحوم کے ممتاز تلامذہ میں تھے

انھیں جو عقیدت اپنے استاد سے تھی وہ عشق کے درجہ تک پہونچ چلی تھی۔ مگر آج استاد اور شاگرد دونوں آسودۂ خاک ہیں۔ اور جو مادی حجاب فی مابین باقی تھا وہ اب بالکل اُٹھ چکا ہے۔

میرؔ و غالبؔ، آتشؔ و ناسخؔ۔ جلالؔ و امیرؔ ذوقؔ و داغؔ کی فہرست میں اقبال کی موت نے ایک نام کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ جس طرح یہ مسافرین صدیاں گذر جانے کے بعد بھی زندہ ہیں اسی طرح امید ہے۔ کہ اقبال کا نام اور کام بھی صدیوں زندہ رہے گا۔

مجھے ڈاکٹر اقبال کی غیر متوقعہ موت کا اس لئے اور بھی صدمہ ہے۔ کہ وہ میرے ہم نوا اور ہم رنگ تھے۔ میرا اور ان کا ایک ہی نصب العین تھا میرے اور ان کے افکار میں بڑی حد تک توازن تھا اب میں دنیائے ادب میں اپنی تنہائی محسوس کر رہا ہوں اور اقبال کی موت پر باوجود یقین کے یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر اقبال کی موت اسلامیان ہند کے دماغ کی موت ہے۔ ہندوستان اب صدیوں تک ایسا مفکر پیدا نہیں کر سکتا وہ حقیقت میں اپنی قوم اور اپنے ملک کا دماغ تھے۔ جبکہ دوسرے شعرا صرف دل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر جس قوم کا دماغ افسردہ ومردہ ہو جائے صرف اس کا دل،، کیونکر وجہ حیات ہو سکتا ہے اس دور زوال و انحطاط میں اسلامی سیاست و تہذیب معرض امتحان میں ہے ایسے وقت اقبال کی جدائی ہماری بیچارگی میں ایک المناک

اضافہ ہے جسے آج نہیں تو کل میری طرح تمام ملک محسوس کرے گا
یہ ہنگامی مجالس عزا غم کا ایک رواجی مظاہرہ ہیں ان مظاہروں
کے بعد قوم علی العموم اپنے محسنوں کو بھول جایا کرتی ہے۔ اگر قوم و
ملک کے دل میں ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی واقعی عزت و
عقیدت ہے۔ تو اسے مرحوم کے پیام و درس پر عمل کرکے اپنی
مشاہیر دوستی کا عملی ثبوت دینا چاہیئے۔

۲۷-اپریل ۱۹۳۸ء

سیماب اکبرآبادی

"شاعر"
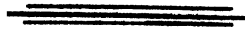
ڈاکٹر اقبال کی موت پر

حضرت اعجاز صدیقی اکبرآبادی کے خیالات

جب لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال مر گئے تو گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ زندگی کو موت آئی۔ حالانکہ زندگی فی نفسہٖ فنا اور موت تو کجا انحطاط سے بھی بے نیاز ہے۔ زندگی یا حیات ایک قوت الہیہ ہے اور تمام الٰہی قوتیں غیر فانی ہیں۔ یہ قوت حیات جب نباتات اور جمادات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تو ان سے بھی مافوق الفطرت افعال و احوال کا صدور ہونے لگتا ہے۔ پھر جب انسان پر اس کا پَرتو پڑتا ہے تو جو عضو زیادہ متاثر ہوتا ہے اسی سے کچھ نمایاں کام ہونے لگتے ہیں۔

یہی قوت حیات ڈاکٹر اقبال مرحوم کے ذہن و دماغ پر عکس افگن تھی۔ اس لئے ان کے ذہن و دماغ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ مطلق زندگی بن کر نکلتا تھا اور اس لئے زندگی کا احساس کرنے والے انسان ان کے فرمودات سے متاثر ہو کر بے چین ہو جاتے تھے۔ انسان اپنے جسم کے ساتھ فانی ہے مگر اپنے کام اور نام کے ساتھ باقی رہ سکتا ہے عہد عتیق کے قدیم ترین انسانوں کا نام بھی کبھی کبھی تاریخ عالم میں

آجاتا ہے۔ اور ہم سمجھ لیتے ہیں۔ کہ آج سے کروروں سال پہلے بھی ایک انسان ان خصوصیات کے ساتھ معرض وجود میں آچکا ہے۔

دس ہزار اور بیس ہزار سال پہلے کے انسان تو ہمارے تذکروں میں روز شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل انسان کی جسمی حیات نہیں بلکہ روحانی حیات ہے۔ باطنی زندگی ہے۔ اور انسانی زندگی کا وہ پہلو ہے جسے غالباً فی صدی ۹۵ انسان نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال کی جسمانی حیات میں کوئی خصوصیت نہ تھی وہ ایک سادہ اور معمولی انسان تھے، اکثر بیمار رہتے تھے بیشتر جسمانی عوارض کا شکار رہتے تھے، مگر قوت حیات کا مرکز ان کا ذہن تھا۔ جو ہمیشہ تندرست اور صحیح رہا، یہاں تک کہ مرتے وقت بھی وہ ایک مفکر شاعر ثابت ہوتے رہے، اور اپنی تازہ اور پرانی رباعیاں پڑھتے رہے۔ آج تمام ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کا ماتم کیوں ہے صرف اس لئے کہ وہ تمام ہندوستان کے لئے ایک مفکر اور ایک پیامی تھے۔ وہ سب سے پہلے شاعر اور اس کے بعد کچھ اور تھے حکومت نے "سر" کا خطاب دیا۔ مگر اقبال سیاست کے لئے تادیر اور مسلسل کارآمد ثابت نہ ہو سکے، یہ اور بات ہے کہ ان کے مفکرانہ جذبات کو سیاسی جذبات سمجھ لیا جائے ورنہ ان پر شاعری سیاست سے زیادہ غالب رہی۔

ڈاکٹر اقبال بیرسٹر بھی تھے۔ لیکن ان کی بیرسٹری کبھی شاعری سے زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئی بہت کم لوگ ہیں جو بحیثیت بیرسٹر ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تھے۔ مگر حکومت کی کرسی پر بیٹھکر انہوں نے نظام حکومت میں کبھی حصّہ نہ لیا۔

غرضکہ وہ دنیا کے کسی شعبے میں "ادیب" سے زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ اس کا سبب صرف یہی تھا۔ کہ قدرت نے انھیں ایک مفکر اور ایک شاعر بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔ اور بالآخر اسی نوعیت سے وہ آج بھی ہم میں باقی ہیں اور صدیوں باقی رہیں گے۔

ڈاکٹر اقبال کا پنجاب میں پیدا ہو کر ایک ہمہ گیر شاعر و مفکر بن جانا قدرت کا معجزہ ہے۔ وہ ہی قدرت جو موسیٰ علیہ السلام کو باوجود لکنت اپنا کلیم بنا لیتی ہے اور وہ ہی قدرت جو خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باوجود امّی ہونے کے افصح العالم ثابت کر دیتی ہے۔

ورنہ تاریخ ادب اٹھا کر دیکھ لیجئے پنجاب نے اردو زبان کا کوئی مشہور شاعر کسی عنصر میں پیدا نہیں کیا۔ بیشک وہ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے، لیکن ان کا کلام داغ مرحوم کا کلام نہ تھا۔ بلکہ انھیں کا سرمایۂ فکر تھا۔ مرزا داغ دہلوی کے اور بھی شاگرد ہیں۔ لیکن بہ استثناء چند کسی کو وہ شہرت و عظمت حاصل نہ ہوئی جو اقبال سیالکوٹی کے حصہ میں آئی۔ یہ صرف قدرت کا ایک عطیہ تھا۔ وہ چاہے تو اب

بھی۔ پنجاب بنگال۔ مدراس، دکن یا سندھ کے کسی گاؤں میں ایک مجتہد الشعراء پیدا کر دے۔ جو لوگ یہ سمجھے ہیں کہ محنت مطالعہ اور سیاحت سے دوسرے فرزندان پنجاب بھی اقبال بن سکتے ہیں میری رائے میں غلط اندیش ہیں، کمال شاعری ایک وہبی عطیہ ہے۔ جو پیغمبروں کی طرح کبھی کبھی کسی کسی کو ودیعت ہوتا ہے۔ اور اسی طرح کہ پھر اس پر کوئی دوسرا دنیاوی کمال غالب آ ہی نہیں سکتا۔

ڈاکٹر اقبال کی طرح آج پنجاب میں اور پنجاب کی طرح ہر صوبہ میں۔ ڈاکٹر آف لٹریچر، ایم۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لا اور "سر" موجود ہیں، ان سے زیادہ سیاحت پسند اور آزمودہ کار لوگ موجود ہیں۔ مگر کیا یہ سب یا ان میں سے کوئی ایک "اقبال" بن سکتا ہے؟۔

کیا میر کے بعد کوئی دوسرا میر، غالب کے بعد کوئی دوسرا غالب، داغ کے بعد کوئی دوسرا داغ۔ اور امیر مینائی کے بعد کوئی دوسرا امیر مینائی ہندوستان نے پیدا کیا؟ کیا لسان العصر اکبر الہ آبادی کے بعد طنزیات اور مزاحیات میں کمال رکھنے والا کوئی دوسرا شاعر ہندوستان میں پیدا ہوا؟

ان سب سوالوں کا جواب واقعات کی طرف سے نفی میں ہے اور اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اقبال کے بعد بھی کوئی دوسرا اقبال پیدا نہیں ہو سکتا۔

فضلنا بعضکم علیٰ بعض،، کا بحیثیت مسلمان میں بھی قائل ہوں۔ اسی

لئے یہ کہنے میں مجھے مطلق باک نہیں کہ ڈاکٹر اقبال کے بعد فضل و کمال اور شہرت وعظمت میں اگر کبھی کوئی فرزند ہندوستان نسبتاً بڑھ جائے تو ممکن ہے۔ لیکن جو خصوصیات مرحوم میں تھیں انھیں عمدہ خصوصیات کے ساتھ اسی دور میں کوئی شاعر " مثل اقبال ہو جائے یہ ناممکن ہے۔

ہمارے زمانہ کے اکثر موجودہ شعراء اقبال مرحوم کی فکر رسا کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتے، شاعر محض اور شاعر مفکر میں بہت بڑا فرق ہے، شاعر محض ایک رسمی اور تقلیدی شاعر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کا کلام اس سے بھی پہلے مر جاتا ہے۔ اور اسے بھی دنیا میں کوئی امتیازی زندگی نہیں ملتی۔ مگر ایک مفکر شاعر کا کلام اس کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور اُسے بھی اپنے ساتھ زندہ رکھتا ہے۔"

ڈاکٹر اقبال کی اولاد میں کوئی شاعر نہیں، نہ آفتاب اقبال اور نہ جاوید اقبال۔ مرحوم نے کسی کو اپنا شاگرد بھی نہیں کیا مگر مجھے کہنے دیجئے۔ کہ وہ اپنا ایک خاص اسکول، اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں جو ان کی تصانیف میں باقی اور موجود ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی پیروی کرنے والے آج تمام ہندوستان میں پائے جاتے ہیں اکثر و بیشتر ان کے اسلوب بیان کی تقلید کی جا رہی ہے، اور کی جائے گی لیکن یہ تقلید صرف ان کے پیام و درس کی بہ انداز مختلف ترجمانی ہوگی۔

جسے اختراع و تجدید سے کوئی نسبت نہیں۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شاعری پر ایک اعتراض یہ تھا کہ وہ آخر میں اسلامیات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے مگر اعتراض کرنیوالوں نے یہ سمجھنے اور سوچنے کی کوشش شاید کبھی نہیں کی کہ جو مذہب ایک عالمگیر مذہب ہے اس سے وابستہ شاعری بھی عالمگیر ہی تو ہوگی محدود کس طرح ہو سکتی ہے اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اسکے قوانین بھی ہمہ گیر ہیں۔ اور اس دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں اسلام نہ پہونچ چکا ہو، پھر جو شاعری ایک ایسے مذہب سے تعلق و واسطہ رکھتی ہو وہ غیر عالمگیر کیونکر ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر اقبال کی فکر میں جو آزادی، رواداری، مساوات اور وسعت تھی وہ مذہبی تصور ہی سے وابستہ تھی۔ خدا نے انہیں مسلمان بنا کر مسلمانوں میں اس ہی لئے پیدا کیا تھا کہ وہ اسلام کی خدمت کریں۔ " وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے "، تو ان میں اسلام کے ساتھ جو وفاداری کا جذبہ تھا وہ ان کے حقیقی مسلمان ہونے کی دلیل تھا، جس کا اقرار انہوں نے مرتے مرتے کیا۔ یعنی مرنے سے چند منٹ پہلے کہا کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں مسلمان ہوں اس سے زیادہ ان کے مسلمان ہونے کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے اس سے

یہ اعتراض نہیں بلکہ اعتراف ہے کہ ڈاکٹر سر اقبال کی شاعری "اسلامیات" سے وابستہ تھی۔

ہمیں سروش غیب کا ممنون ہونا چاہئیے۔ کہ اس نے ایک ایسا

مفکر ہمیں دیا ، جو ہماری ہی زبان میں ، ہمیں درس دے سکا اب
اس تک کے درس و پیام پر تنقید فضول ہے ، اب اس کی زندگی پر
بحث کرنا لاحاصل ہے۔ اب تو وقت کی رفتار اس حد تک پہونچ
چکی ہے کہ جو درس و پیام جس حد تک ختم ہو چکا ہے۔ اسی حد تک
ہم اس پر عمل کریں۔ اور جب ہمارا عمل درجہ تکمیل تک پہونچ جائے
تو دوسرے الہامات کا انتظار کریں۔

ہر دور اپنی ضروریات و خصوصیات کے اعتبار سے مختلف ہوتا
ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے پیغامات اسی دور کے لئے مختص ہیں اب
لفظوں کی بحث سے گذر کر ہمیں معنے اور حقیقت کی طرف رجوع ہونا
چاہیئے ، اور میرے خیال میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے ساتھ سب سے بڑی
عقیدت مندی کا اظہار صرف اسی طرح ممکن ہے۔

مرحوم کی یادگاریں تمام ملک میں قائم ہوں گی ، ان کے نام کے
انتساب سے قومی و ادبی ادارے موسوم ہوں گے۔ لیکن یہ سب
مادی اور ظاہری یادگاریں ہیں۔ جو اُن کے مادّی جسم کی طرح ایک
دن فنا ہو جائیں گی۔ اُن کی حقیقی یادگار صرف یہی ہے کہ مسلمان
اُن کے اشارات پر عمل پیرا ہوں اور ان کے کلام میں جو فطرت
کی آواز پوشیدہ ہے اُسے سمجھنے کی کوشش کریں ،،

افسوس یہ ہے کہ آج منظوم تصانیف کی طرف صرف اس
خیال سے توجہ نہیں کی جاتی۔ کہ ان میں صرف "شاعری" ہوتی ہے

اور شاعری بجائے خود کوئی مفید چیز نہیں سمجھی جاتی، مگر ڈاکٹر اقبال کی تصانیف میں صرف شاعری ہی نہیں۔ حکمت اور فلسفہ بھی ہے اور وہ سب کچھ ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ اقبال کی موت پر آنسو بہانے سے زیادہ اچھا یہ ہے کہ ان کا کلام پڑھکر روحانی مسرت حاصل کی جائے اور روح میں عمل کی قوت پیدا کرکے قومیت میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا جائے۔

اعجاز صدیقی اکبرآبادی

"شاعر"
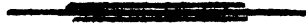
حیاتِ اقبالؒ

(از محمد مشتاق صاحب شوقؔ چاندپوری)

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

حضرت علامہ اقبال مرحوم نے یہ شعر میرے لئے اس دن کو مدنظر رکھ کر کہا تھا۔ جس کا زندہ ثبوت ان کا تخلص ہے اقبال کا مادہ قبل ہے اور قبول و مقبول کا مادہ بھی قبل ہے۔ اقبالؔ کو مقبولیت نام سے کام سے اور تخلص سے کملاً حاصل ہوئی، یعنے نام اقبال تخلص اقبالؔ، کام نیک اقبال کے معنے ہیں قسمت نیک کا سامنے آنا دولت حاصل ہونا۔ یا محض دولت، اس سے ثابت ہے کہ اقبال کو دولت دارین، نام۔ کام۔ اور تخلص سے حاصل ہوئی، اور کیوں نہ ہوتی، ہادی قوم تھا۔ موا حد تھا۔ عاشق رسول تھا، مداح صحابہ تھا۔ بزرگوں کا نام لیوا تھا۔ نام رفتگاں زندہ کرنے والا تھا۔ ہر قوم و ملت کو پیغام انسانیت پہونچاتا تھا اور

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

کا حامی تھا، نام کا اثر معلوم، تخلص کا اثر ظاہر۔ میر محمد تقی نے میر تخلص رکھ کر میری کی۔ سودا بازار شاعری میں سوداگری کا بازار گرم کر گئے درد۔ درد کی داستان سنا گئے۔ ذوق ذوق شاعری پیدا کر گئے، آتش نے گلشن سخن میں گل ولالہ سے آگ لگا دی، مصحفی نے شاعری کے نئے صحیفے پیش کئے، انیس نے اہل بیت کی محبت کے باب کھولے، ناسخ نے اردو کو نیا جامہ پہنایا۔ تپش نے تپش عشق کو شعر کی صورتیں نمایاں کیا، داغ نے محبت کے داغ ہرے کر دئے۔ غالب نے علی کل غالب کی راگنی سنائی۔ اور اقبال نے ان سب کی دولت کو جمع کر کے اپنے دامن مقصد کو پر کیا۔ اور قال کو حال سے ملا کر میٹھے حال کی صدا۔ غالب کی تخیل پرواز۔ میر کا اثر، سودا کا زور۔ ذوق کی چاشنی۔ انیس کی عقیدت، داغ کی زبان۔ تپش کی تراکیب۔ مولوی سید امیر حسن کی تعلیم۔ آرنلڈ کی شفقت اور میگ ٹیگرٹ کے مشورے کے اجزا سے وہ مرکب کلام سخن تیار کیا جس نے سعدی کی موعظت، غالب کی فکر۔ بیدل کی طرز۔ عرفی کا رنگ۔ حافظ کی بادۂ دوآتشہ، گوئٹے کا فلسفہ، روسو کی فطرت پسندی۔ نیٹ شے کی حریت خواہی، چستی قناعت۔ پژدہی۔ تازگی۔ زور۔ اور ندرت بیان کے ساتھ پیرس کی سرزمیں۔ لندن کے بازار۔ ہسپانیہ کی ارض، کابل کے خطے بر تنی کی حدود۔ سسلی کے جزیرے۔ اور ہندوستان کی مملکت میں ضرب کلیم اور بانگ درا کی قوت کو بال جبریل کی پیرواز کے

ساتھ اسرار خودی اور بے خودی کے رنگ میں مستغرق ہو کر مذاق زمانہ اور ضرورت وقت کا خیال رکھتے ہوئے ہر ملت، ہر قوم اور ہر ملک کی شاہراہ مستقیم پر گامزنی کا پیغام دیا۔ لیکن فارسی کی شیرینی عربی کی تشبیہات اور مغربی تخیل کو اس طرح ہم آہنگ کیا کہ ہر بند وطن پرستی کا ایک ترانہ تھا، اور کشش کا ایک نغمہ دنیا اگر اس ہمہ گیر شاعر کو اس لئے اسلامی شاعر سمجھ لے کہ وہ مسلمان پیدا ہوا تھا مسلمان مرا۔ اور یہ سمجھ کر دنیا کو درس اسلامی دیتا رہا کہ اسلام مابین عبد و معبود وہ حقیقی سودا ہے جس میں ہر صورت سے تکمیل انسانیت کا پہلو مکمل نظر آتا ہے۔ تو اس کے اس فلسفہ کو نقاد جس نام سے چاہیں تعبیر فرمائیں میں اس کو ایک حقیقی پیغام رساں شاعر کہوں گا، اور ترجمان حقیقت کا نام دینے والے اصحاب کی آواز پر لبیک کی صدا بلند کئے بغیر نہ رہوں گا، یہ تھا وہ شاعر جو ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ عالم وجود میں آیا اور ۲۱ را پریل ۱۹۳۸ء میں داعیٔ اجل کو ۶۲ سال ملک، ملت، قوم اور دنیا کی خدمت کرنے کے بعد لبیک کہہ گیا، یہ آسمان ادب کا درخشندہ ستارہ امتیازی صورت سے وظیفہ لیتا ہوا ۱۸۹۵ء تک انٹرمیجیٹ کی سند حاصل کر کے مشن اسکول سیالکوٹ سے لاہور پہونچا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور سے چار سال کے دوران میں فلسفہ اور سیاست کی ڈگریاں۔ بی اے۔ اور ایم۔ اے کلاس کی حاصل کیں اور چند سال انھیں مضامین کا لیکچرار اور اردو و انگریزی

کا اسسٹنٹ پروفیسر رہ کر سفر ولایت ۱۹۰۵ء میں اختیار کیا، اور ۱۹۰۸ء
تک انگلینڈ۔ جرمنی۔ فرانس۔ اور ہسپانیہ کی سیر بھی کی، اور علمی
سندیں بھی نمایاں صورت سے حاصل کیں۔ درس بھی دیا۔ اور تدریس
بھی رہی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے اخلاق کی ڈگری حاصل کی، جرمنی
... یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی یعنے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی فرسٹ
کلاس ڈگری ایک کتاب بنام فلسفۂ ایران لکھ کر حاصل کی جو بہت
مقبول ہوئی۔ اور جس کا ترجمہ انگریزی میں بڑی عزت کے ساتھ
کیا گیا ہے۔ پھر لندن واپس تشریف لائے، بیرسٹری پاس کی
پروفیسر رہے، اسلام پر چھ لکچر دئے۔ عیسائی دنیا کو تحیر میں ڈال
دیا۔ عربی فارسی کا نہایت گہرا مطالعہ کیا، اور یہ سب ۳۲ سال
کی عمر تک حاصل کر لیا، اور بمبئی۔ دہلی۔ انبالہ ہوتے ہوئے۔
جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز پیر شام کی گاڑی سے لاہور پہونچے اور
اس وقت سے ۱۹۳۴ء تک بیرسٹری کرتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں
گورنمنٹ نے آپ کی بے پایاں قابلیتوں سے متاثر ہو کر آپ
کو سر کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے
ممبر منتخب ہوئے ۱۹۲۸ء میں اسلام پر لیکچر دینے کے لئے مدراس
گئے۔ ۱۹۳۵ء میں بھوپال گورنمنٹ نے آپ کی علمی اور ادبی،
خدمات کی عزت افزائی کے سلسلہ میں ۵۰۰ روپیہ ماہانہ تاحین
حیات مقرر فرمائے۔ آپ نے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی متعدد

بار صدارت فرمائی۔ ڈاکٹر اقبال نے ۱۸۹۶ء سے لکھنا شروع کیا اور
اور ۱۸۹۹ء میں نالۂ یتیم اور ۱۹۰۱ء میں

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستان
زیب دیتا ہے تجھے کہئے اگر سارا جہاں

کی نظم لکھ کر شہرت عامہ حاصل کی اور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۴ء تک کا
کلام بانگ درا کی صورت میں شائع کیا۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۵ء تک
کا کلام "بال جبریل" کے نام سے چھپا اور باقی کلام "ضرب کلیم" کی
صورت میں رونما ہوا۔ آپ نے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک جو کچھ
لکھا وہ مشرقی جذبات، مغربی تخیل اور ملکی جوش کا اعلیٰ نمونہ ہے
۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک آپ کی شاعری کا دوسرا دور اور اسی
دور میں آپ فارسی شاعر بن جاتے ہیں اور مشاہدات قدرت کا
رنگ گہرے طور پر چھا جاتا ہے، اب پروفیسر آرنلڈ کی ہمت افزائی
پر اور ایک دوست کی طعنہ زنی پر مستقل فارسی گو شاعر ہو جاتے ہیں
، تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء
میں مسلمان اور اسلام کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر شاعری کا رُخ
اسلامی درس کی طرف تبدیل فرماتے ہیں۔ مگر اُس طرح کہ عالمگیر
ہمہ روی پس پردہ جلوہ نما نظر آتی ہے، ٹیگور آپ کی شاعری کو
عالمگیر کہتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو آپ کے کلام کو حیات آفرین
دو مستقبل اور دورِ حاضرہ کے بتلاتے ہیں، سر تیج بہادر سپرو آپ کو

بلندئ تخیل میں یکتا شمار کرتے ہیں۔ ہندوستان کی ہر سیاسی، ادبی، علمی اور حکمران ہستی آپ کو مصلح اعظم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ہر شخص آپ کا ماتمی ہے اور شاید اس لئے کہ آپ کا فلسفہ سچا، آپ کی نصیحت مفید اور بے لوث، آپ کا تخیل اعلیٰ، آپ کی بلند پروازی ارفع، آپ کا زور کلام موقر، آپ کی زبان شستہ، آپ کی بندش پاکیزہ، آپ کی طرز ادا معزبیت کا نمونہ، آپ کا درس ہم آہنگ، آپ کا مذہب اسلام، آپ کی ملت ابراہیمی، آپ کا رویہ سکون اور مطالعہ وسیع۔ آپ نے ظرافت کو بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا، آپ کا جاوید نامہ نوخیز نسلوں کے لئے آپ کا پیام مشرق تمام دنیا کے لئے، آپ کی بانگ درا، ہر متنفس کے لئے، آپ کی ضرب کلیم اور بال جبریل مسلمانوں اور مذہبی پیشواؤں کے لئے دائمی درس ہے آپ کی، اسرار خودی اور رموز بے خودی سے فلسفی دنیا تشنگی تا قیام دو عالم بجھاتی رہے گی۔ ایسی حالت میں آپ کا وفات سے چند لمحہ پہلے یہ رباعی کہنا صداقت کا زندہ ثبوت ہے۔

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے اور مسلمانوں کو آپ کے کلام

سے فائدہ اٹھانے کی اور دنیا کو ان کا تتبع حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین"

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنے رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم "شاعر"

نوحۂ اقبالؔ

از محمد مشتاق صاحب شوقؔ چاندپوری

فکر اک ایسی ہوئی افسوس دامنگیر دل
جس سے سنبھلے دل نہیں ایسی کوئی تدبیر دل
اضطراب و یاس و حسرت بن گئے زنجیر دل
ہائے یہ افتاد، یہ احساس، یہ تقدیر دل

لو خدا کا گھر بھی اَب آفات کا گھر بن گیا
کھو کے دِل اقبالؔ کو صدمات کا گھر بن گیا

کون؟ وہ اقبالؔ جو تھا شاعر ہندوستاں
شاعر یکتا جسے کہتی تھی دنیا بے گماں
رفعت تخئیل پر جس کی جھکا تھا آسماں
ترجمانی میں حقیقت کی رہا جو سرگراں

موت سے اِس کی تن بیجان ملّت رہ گئی
ملک کی اور قوم کی ناکام عزّت رہ گئی

اس نے غالب کو سراہا اک نرالے رنگ سے
پیروی گیٹے کی کی اس نے مناسب ڈھنگ سے
اس کو شکوہ ہی رہا یورپ کے ذوقِ جنگ سے
تھا مؤثر وہ تو تھا مسلم کے نام و ننگ سے
عظمت بانگ درا ضرب کلیمی بن گئی +
ساتھ ہی اس گل کے ساری فطرت گلشن گئی

"شاعر"

"شاعر کا پیغام"

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی روح کے نام

از۔ حضرت سیماب اکبرآبادی

تو صورتِ صد پیام زندہ ہے یہاں
زندہ ہے، علی الدوام زندہ ہے یہاں
مرحوم تجھے کہیں، تو نادانی ہے
زندہ ہے وہ جس کا نام زندہ ہے یہاں

"شاعر"

شاعرِ اسلام

از یکتا حقانی امروہوی مولف
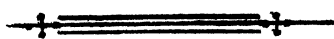
آہ اے اقبالؔ! اے سرچشمۂ علم و ادب!
تیرے اٹھ جانے سے سُونا ہند و ایران و عرب

تیرے اٹھنے سے نہ کیوں روحِ ادب پژمردہ ہو
کیوں نہ تیری موت سے دل قوم کا آزردہ ہو

تو کہ تھا علم و ادب کے ساتھ، ملت کا مُعین
ذات سے تیری تھی علم و قوم کی روشن جبیں

تیرے دل میں دونوں ان جذبوں کا سوز و ساز تھا
تو ادب کی روح تھا تو قوم کی آواز تھا

تیرے دل کے ساز میں پنہاں تھا سوزِ کائنات
تیرا ہر نغمہ تھا اہلِ دل کی تفسیرِ حیات

شاعرِ فطرت تھا اور تو شاعرِ اسلام تھا
درس دینا شعر کی صورت میں تیرا کام تھا

آج کیا تیری کمی محسوس ہوتی ہے ہمیں
قوم کی بدقسمتی محسوس ہوتی ہے ہمیں

آہ سر محمد اقبال مرحوم

از۔ حضرت سید دلبر حسین صاحب مستور بی۔ اے۔ جوائنٹ اڈیٹر اخبار سرفراز لکھنؤ

میری خوش قسمتی سے کتاب ہذا کے دوران تالیف میں حضرت مستور ہمراہ حضرت مولانا ظفر مہدی صاحب نصیر آبادی مدظلہ، دہلی تشریف لائے کمترین جب مولانا ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا تو مستور صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو میں اس کتاب کی تالیف کا بھی تذکرہ آگیا۔ اور میری عرضداشت پر موصوف نے حسب ذیل نظم عنایت فرمائی جو انتہائی شکریہ کے سات پیش ہے،، (مولف۔

اے کہ تو پیکر نگار فطرت معصوم تھا
تیری پیشانی پہ بہتر زندگی مرقوم تھا

افتخار ایشیا، صد نازش ہندوستاں
اس پریشانی میں تھا تو دولت اسلامیاں

دوڑتا تھا تیری رگ رگ میں لہو اسلاف کا
تو مرقع تھا جہاں میں یثربی اوصاف کا

آتشیں نغموں نے تیرے آگ تن میں پھونکدی
روح آزادی مرے مردہ وطن میں پھونکدی

آہ اب تیری جہاں میں نغمہ پیرائی نہیں
ملت مجبور کی تجھ تک پذیرائی نہیں

رو رہی ہے ملت مرحوم اب تیرے لئے
اور ہے افسردہ و مغموم اب تیرے لئے

ہے یہی مستور غم آگاہ کی دل سے دعا
تیری تربت پر ہو ظل تاجدار ہل اتیٰ

رحمتوں کی تیرے مرقد پر فراوانی رہے
تا قیامت بارش انوار یزدانی رہے

آئینہ غم

از جناب سید کوثر علی صاحب کوثر امروہوی

رازِ ملت کا راز داں اقبال
باغِ اردو کا باغباں اقبال

جس کا مشرب تھا خدمت قومی
جس کا مسلک حمایت ملّی

بے زبانوں کی جس کو کہیئے زباں
جو تھا مذہب کی اپنے روحِ رواں

جس کو دنیا ادیب کہتی تھی
اپنا اعلیٰ خطیب کہتی تھی

تھا لقب جس کا شاعرِ اعظم
شاعر و شعر و شاعری کی قسم

جس نے چھوڑا نہ کوئی اپنی مثال
چل بسا آج ہائے وہ اقبال

تھا غنیمت جہاں میں دم اس کا
کیوں نہ کوثر منائے غم اس کا

قطعاتِ تاریخ

بر وفاتِ حسرت آیاتِ

علامہ اقبال

مرحوم

کوثر نے لکھا

یہ وہ قطعاتِ تاریخ وفات ہیں

جو

شعرائے ہندوستان نے آپ کی ناوقت موت سے متأثر ہو کر لکھے! اور اپنی محبّت و عقیدت کا ثبوت دیا، ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے پیش کئے جاتے ہیں، اُمید پسند خاطر ہوں گے،،

"مولّف"

شاعرِ مشرق

از حضرت آغاز برہانپوری

بست رختِ سفر بہ بست صفر — ترجمانِ مناظرِ مشرق
گفت آغاز بہرِ مہرِ کمال — بود اقبالِ شاعرِ مشرق
۱۳۵۷ھ

عیاں ماتمی صورتِ حال حیف — بصد یادگارِ غم ایں سال حیف
پئے سالِ آغاز ماتم گسار — بگفتہ، قضا کرد اقبال حیف
۱۳۵۷ھ

برفت جانبِ حق از جہاں خواب سرا — بلند منزلتِ اقبال ہمرکابِ عروج
فلک مقام بزیرِ زمیں گشت آغاز — نہاں شد از نگہِ صبح آفتابِ عروج
۱۳۵۷ھ

از غمِ اقبال شد ماتم کناں جملہ جہاں — حق سرست اہلِ ادب مردِ یگانہ فوت شد
ایں ندا آمد بگوشِ من پئے سالِ وفات — شاعرِ اسلام مشہورِ زمانہ۔ فوت شد
۱۳۵۷ھ

زہے کرشمۂ فیضانِ مرقدِ اقبال — کہ گشت مرجعِ تسکینِ پیر و برنائے
نقیبِ عظمتِ مینارِ مسجدِ شاہی — مزارِ شاعرِ مشرق بہر آرائے
۱۹۳۸ء

پروانۂ ناطق

از حضرت سیماب اکبرآبادی

نوزدہ[۱۹] ماہ صفر، وقت صباح — روح اقبال از غم لاحق گزشت
عارف حق، قائدِ ملت نہ ماند — مردِ مومن، بندۂ صادق گزشت
رازدارِ سوز و سازِ انجمن — صورتِ پروانۂ ناطق گزشت
کرد چوں سیماب فکر سال مرگ
گفت ہاتف، شاعر مشرق گذشت

"شاعر" ۳۸ ۱۹ء

ڈاکٹر اقبال

از

حضرت محمد خاں صاحب نیرؔ خورجوی"

شد بہ اسلام خاتمہ بالخیر — اے خوش آئین ڈاکٹر اقبال
شاعر چاک کرد جامۂ خویش — بہر تکفین ڈاکٹر اقبال
گفت سال وفات او نیرؔ
خواب شیرین ڈاکٹر اقبال

۱۹ ۶ ۳۸

ریٹنگ عمر

از جناب نثار صاحب اٹاوی

آسماں برگ ناگہاں انداخت — رُوحِ سعدی و جانِ طالب مُرد
گفت از من نثار ہاتفِ غیب — آہ اقبال رشکِ غالب مُرد

"شاعر" — ۳۸ ۶ ۱۹

"بلند آستاں ڈاکٹر اقبال"

۵۷ ۵ ۱۳

"بلند اقتدار علامہ سر اقبال"

۵۷ ۵ ۱۳

"ذات اقبال مجمع الحسنات"

۳۸ ۶ ۱۹

"ہائے حسرت شاعر شیریں بیاں"

۳۸ ۶ ۱۹

"بود اقبال شاعر مشرق"

۵۷ ۵ ۱۳

"شاعر شیریں بیاں اور رنگ نشیں"

۳۸ ۶ ۱۹

"مہ اسلام ڈاکٹر اقبال"

۳۸ ۶ ۱۹

"اہل رحمت شاعر شیریں بیاں"

۳۸ ۶ ۱۹

"آفتاب مجسم ڈاکٹر اقبال"

۵۷ ۵ ۱۳

"شاعر"

درد کی مٹی سے ہوتی ہے سرشت شاعر
کلفت و رنج و مصیبت ہی نوشت شاعر

اوراق الخیال

یعنی
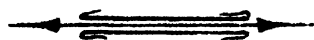
نتیجہ دماغ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

پر

ایک سرسری نظر

علامہ ڈاکٹر اقبال

کے

اُردو کلام پر صرف سرسری نظر
ڈال کر یہ بتلانا ہے کہ ڈاکٹر اقبال
کے دل میں کس کس قسم کے لطیف
جذبے تھے۔ جو شعر کی صورت میں
زبان سے نکلے اور صفحۂ قرطاس پر
نمودار ہوئے۔

(مؤلف)

بانگِ دَرا

یہ کتاب آپ کے شاعری کے ابتدائی پندرہ سولہ سال کی اُن اُردو نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے جو اس مجموعہ کی صورت اختیار کرنے سے پہلے مختلف اخبارات اور رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں لیکن چونکہ ملک کو جناب کی شاعری بے حد پسند اور محبوب تھی۔ اس لئے ملک کو اشتیاق تھا کہ آپ کا کلام مجموعی صورت سے شائع . . . چنانچہ ایک کتاب کی صورت اختیار کرکے بانگِ درا کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ اور آناً فاناً ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا۔

بانگ درا کا مقدمہ آپ کے حقیقی دوست سر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا سابق مدیر جریدۂ مخزن کے قلم کا نتیجہ ہے جس میں موصوف نے اقبال کی علمی قابلیت اور شاعری اور خیال ترکِ شاعری اور اس کے بعد شعر گوئی پر قائم رہنے اور اس کے بعد آپ کی بلند خیالی اور فلسفی ہونے پر مکمل روشنی ڈالی ہے اور خوب خوب ڈالی ہے۔

واقعہ ہے کہ شیخ عبدالقادر صاحب مدظلہ سے زیادہ ذاتِ اقبال سے کوئی صحیح واقف بھی نہ تھا اس لئے کہ آپ نے ڈاکٹر اقبال کی زندگی کا مکمل مطالعہ کیا تھا اور آپ کے ساتھ رہ کر کیا تھا۔ یورپ میں آپ

کلیات اقبال کا عرصہ تک ساتھ رہا اس کے بعد ہندوستان میں آپ
کے ساتھ رہنے کا مصنف کو کافی موقع ملا بہرحال سر شیخ عبدالقادر صاحب رضا
نے حقیقتاً بہت سوبا مقدمہ لکھا۔ اور خوب لکھا۔

بانگ درا کی تقسیم :-

"بانگ درا تین حصوں میں منقسم کی گئی ہے
حصہ اول میں ۱۹۰۵ء تک کا کلام ہے
حصہ دوئم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کلام ہے۔
حصہ سوئم میں ۱۹۰۸ء سے تقریباً ۱۹۲۴ء تک کا کلام ہے
یہ تینوں حصے اپنے اپنے رنگ میں جدا گانہ ہیں پہلا حصہ زبان
کی لطافتوں سے پر ہے۔ اور ہندوستانی تعلیم کے زمانہ کا کلام ہے
دوسرا حصہ وہ ہے جو یورپ کے دوران قیام میں آپ نے وہاں کے
ادب اور مناظر اور سیاست سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔
تیسرا حصہ اس کے بعد کا ہے جس کے اندر مکمل فلسفہ ہی فلسفہ
ہے جو مذہب اور سیاست میں ڈوب کر انتہائی انتہاپسندی سے تصنیف
فرمایا ہے اور مختلف موضوعات پر بہتر سے بہتر نظمیں لکھی ہیں اور اہل دنیا
کی نظر میں اپنی بلند خیالی کا ثبوت قائم کر دیا ہے۔
ہر موضوع پر مکمل اور مدلل بحث کی ہے جس کا ہر ہر شعر اہل بصیرت
کے لئے ایک درس ہے اور حقیقی درس۔
بانگ درا میں دو مکمل ادبی پر مغز اور طویل نظمیں ہیں جو شکوہ

اور جواب شکوہ کے نام سے بہت مشہور ہیں اور علحدہ ایک چھوٹی سی کتاب کی صورت سے جگہ جگہ چھپتی رہتی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں ان دونوں نظموں کا جواب نہیں، قوت تخیل اور جذبات حقیقی سے پر ہیں جن کا تذکرہ سلسلہ میں آئے گا۔

بانگ درا کا حصہ اول

بانگ درا کے حصہ اول میں بچوں یعنے ابتدائی طلبار کے پڑھنے کے لئے عام فہم اور سلیس نظمیں ہیں۔ جن میں زبان کی لطافت اور چاشنی ہے۔ بچے پڑھکر بہت خوش ہوتے ہیں۔ میں نے اکثر اسکولوں میں جلسوں میں لڑکوں کو ان نظموں کو پڑھتے سنا ہے۔ جو زبانی یاد کر کے سناتے ہیں خود لطف اٹھاتے ہیں اور دوسروں پر اس کا اثر طاری کراتے ہیں۔ یہ نظمیں ڈاکٹر اقبال نے محض دل خوش کرنے یا بچوں کو بہلانے کیلئے ہی نہیں کہیں۔ بلکہ ایک ایک نظم ایک سبق ہے اور ایسا سبق جو اگر دل میں نقش ہو جائے تو تمام عمر اپنا اثر دکھلائے اور انسان کو انسان بنا دے۔ جن کی سرخیوں یعنے موضوعات سے پتہ چل سکتا ہے کہ یہ نظم کس قسم کی ہوگی۔

سب سے پہلی نظم ہمالہ سے خطاب ہے جو ایک جغرافیائی نظم ہے اور ڈاکٹر اقبال نے اس کو اس رنگ سے کہا ہے کہ یہ معلوم ہوتا

ہے کہ ہمالہ ہندوستان کا انتہائی ہمدرد اور محسن ہے۔ محافظ ہے۔
ایک مصرعہ اس کا یہ ہے ،، ؎

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں

قدرتاً ان الفاظ سے ہندوستان کی محبت اور جذبۂ ہمدردی قائم ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کوہ ہمالہ ہندوستان کے لئے ایک قدرتی فصیل ہے جو غنیم کو آنے سے روکتی ہے۔

اس کے بعد دوسری نظم گل رنگیں ہے اور تیسری نظم ،، عہد طفلی کے عنوان سے ہے۔ اس تیسری نظم میں ڈاکٹر اقبال نے انسان کے زمانۂ طفلی کو یاد کیا ہے۔ اور اس کی کیفیات اور احساسات پر روشنی ڈالی ہے آپ نے ایک شعر میں اس کیفیت کی نقاشی اور تصویر کھینچی ہے کہ بچپن میں معصومیت اور معصومیت ہر جہار جانب ہوتی ہے۔ بچے کو کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ اور زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ روتا ہے۔ اور اس قدر روتا ہے کہ کسی عنوان چپتے کا نام ہی نہیں لیتا تو اس کے ماں باپ اس کو گود میں لے کر دروازہ کی زنجیر کو ہلاتے ہیں۔ اور بچہ رونا بھول جاتا ہے اور اس کی آواز کو سننے میں محو ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

عہد طفلی میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے
شورش زنجیر در میں لطف آتا تھا مجھے

اس کے بعد " مرزا غالب " اور " ابر کوہسار " " ایک مکڑا اور مکھی " ایک

پہاڑ اور بکری،، "ایک گائے اور بکری" وغیرہ عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں۔

اس کے بعد اور ایسی نظموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو اس سے بلند اور ادبی ہیں۔ زبان بہتر۔ اور بلند ہے۔ مفہوم اور موضوع بلند ہیں۔ خیالات بلند ہیں۔ جذبات کی فراوانی ہے۔ اور احساسات کی موجیں اور لہریں ہیں۔ مثلاً ایک نظم جسکی سرخی،، خفتگان خاک سے استفسار،، ہے اتنی بصیرت افروز ہے کہ جواب نہیں رکھتی نظم کی تمہید کے بعد آپ فرماتے ہیں۔

تھم ذرا بیتابیٔ دل بیٹھ جانے دے مجھے
اور اس بستی پہ چار آنسو بہانے دے مجھے

آپ اس شعر میں اپنے قلب بیقرار اور مضطرب کی بیتابی سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے بیتابیٔ دل ذرا اتنا دم لے کہ میں اس گور غریباں میں زیر خاک سونے والوں پر دو چار آنسو بہالوں اس کے بعد آپ تہ خاک سونے والوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور چند سوالات کرتے ہیں جن سے عبرت ہوتی ہے اور جسم کا رواں رواں لرز جاتا ہے فرماتے ہیں۔

اے مئے غفلت سے سرمستو کہاں رہتے ہو تم
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

کیا وہاں بھی دن نکلتا ہے اور رات ہوتی ہے۔ کیا وہاں بھی غم و

مسرت کے انعامات ہیں۔ کیا وہاں بھی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ کیا وہاں بھی شمع و پروانہ کے جھگڑے ہوتے ہیں۔ کیا وہاں بھی گل وبلبل کے قصے ہیں۔ کیا وہاں بھی عشق و محبت کے چرچے ہیں۔ کیا وہاں بھی شعر و شاعری ہوتی ہے کیا وہاں بھی اہل دل ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ شعر سنتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں تو ایک مصرعہ دل کو بیتاب کر دیتا ہے۔ وہاں کا کیا عالم ہے۔

کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے
قافلے والے بھی ہیں اندیشۂ رہزن بھی ہے
تنکے چنتے ہیں تو وہ بھی آشیاں کے واسطے؟
خشت و گل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟

اس کے بعد فرماتے ہیں۔ کہ جس دنیا میں تم رہتے ہو جہاں تم رہتے ہو وہ آخر کیا ہے؟ فردوس کسے کہتے ہیں؟ آپ فردوس کے متعلق اس سے استفسار کرتے ہیں اور اس کی حقیقت سے آشنا ہونا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں سے

باغ ہے؟ فردوس، یا اک منزل آرام ہے؟
یا رُخِ بے پردۂ حُسنِ ازل کا نام ہے؟

آخر جس کو فردوس کہتے ہیں وہ کیا چیز ہے یہ کوئی باغ ہے۔ یا کوئی آرام گاہ ہے یا حسن ازل بے پردہ ہے۔ جس کو فردوس کہتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ بتلاؤ۔

دیدے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی ؟
لن ترانی کہہ رہے ہیں کیا وہاں کے طور بھی ؟

آخر میں یہ شعر فرماتے ہیں۔ اور اپنی نظم اس ہی شعر پر ختم کرتے ہیں۔ کہ اے خفتگان زیر خاک چونکہ تم موت کی شدت سے آشنا ہو چکے ہو اور موت کا راز تم پر کھل چکا ہے تو ؎

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے

اس کے بعد ڈاکٹر اقبالؔ کی ایک نظم "صدائے درد" کے عنوان سے جو آپ نے اپنی قوم کی نفاق پروری سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ اور اپنے رنگ میں بے پایاں جذبات کی مالک ہے۔

اس کے بعد ایک نظم آپ نے لکھی ہے جس کا عنوان " ایک آرزو" ہے جو حقیقتاً ایک درس بیداری ہے اچھے اچھے پہلوؤں سے آپ نے اس نظم کو سنوارا ہے۔

سیّد کی لوحِ تربت

یہ بھی ڈاکٹر اقبالؔ کی انتہائی عبرت ناک اور سبق آموز نظم ہے اور اس نظم میں آپ نے اہل مزار کو متکلم اور شاعر کو مخاطب کی صورت میں دکھایا ہے۔ صاحب مزار۔ شاعر کو اس نظم میں مخاطب

کرتا ہے ۔ اور اس کو چند نصیحتیں کرتا ہے ۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

یہاں ڈاکٹر اقبال نے "الشاعر، تلمیذ الرحمان" کے مقولہ کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی ۔

اس کے بعد اس ہی نظم کا ایک شعر ہے ۔ جس میں اہل مزار شاعر سے مخاطب ہوتا ہے ۔

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

پہلے شعر میں تو شاعر سے یہ خطاب ہے کہ تو چونکہ خداوند عالم کا شاگرد کہلاتا ہے ۔ اس لئے کوئی کام شاعری سے ناجائز نہ لے اور اپنی زبان سے کوئی شعر ایسا نہ نکال اور اپنے دماغ سے کوئی ایسا خیال نہ پیدا کر" جس سے تیری زبان خدانخواستہ ناپاک ہو جائے اگر تو نے ایسا کیا تو تیری آواز کی اور تیرے شعر کی کوئی آبرو نہ رہے گی ۔ کوئی وقعت نہ رہے گی ۔ دوسرے شعر میں کہا ہے کہ پھر کیا کر؟ یہ کر کہ جتنے خدا کے بندے بری راہ پر جا رہے ہیں ۔ اور جن کو خبر نہیں کہ ہم کہاں ہیں اور خدا کو بھول چکے ہیں ان کو ہوش میں لانے کی کوشش کر اور اپنے شعر سے ان میں خدا پرستی اور اس کی پرستش کی ترغیب پیدا کر ایمان آفرینی کر اور نقش باطل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کر

بہر حال شاعری کو صحیح مصرف میں لا۔ اور اس سے جائز فائدہ حاصل کر جس سے دنیا بھی ملے اور دین بھی۔

"تصویر درد"

یہ نظم آپ کی حقیقتاً درد کی تصویر ہی ہے آپ نے قوم کی ناگفتہ بہ حالت سے متاثر ہو کر اس کی اس حالت کا نوحہ لکھا ہے۔ یہ نظم بہت طویل نظم ہے جس کے کئی بند ہیں۔ اور ہر بند میں کافی شعر ہیں پہلے بند میں آپ نے ہر حالت کو خود سے منسوب کیا ہے اور اس کا ردیف قافیہ ہی "داستاں میری" "فغاں میری" رکھا ہے مالیکن اس سے مراد کل قوم ہے۔ جسکی وضاحت آپ نے اس بند کے آخر شعر میں اسطرح فرما دی ہے ارشاد فرماتے ہیں۔

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہو گویا خزاں میری

قوم کے نفاق و تفرقہ کو جو مسلمانوں میں موجود ہے کہ ایک کو ایک نہیں دیکھ سکتا۔ بھائی کو بھائی کھائے جاتا ہے یکجا کرنے کا ارادہ اور ایسا ارادہ جس کو کسی کام کا بیڑا اٹھانا کہتے ہیں کیا ہے اور آپ نے اہل قوم یعنے افراد قوم کو تسبیح کے دانوں سے تشبیہ دی ہے کُل قوم کو ایک تسبیح سے۔ آپ اپنی اس نظم میں کتنے زور کیساتھ فرماتے ہیں۔ اور دعوی کرتے ہیں کہ ؎

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کرکے چھوڑونگا

اپنے دلی جذبہ کا کس ولولے کے ساتھ اظہار فرمایا ہے۔ کہ اگر ان افرادِ قوم کا ایک رشتہ میں منسلک کرنا ناممکن یا دشوار ہے تو میں ان کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے چھوڑوں گا۔ اس کے بعد یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ مجھ کو اس حالتِ قوم سے کیا تکلیف ہے اور میں کیا کر رہا ہوں اور کیا کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے اے ہمنشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کرکے چھوڑوں گا

اس کے بعد نظم میں اور جوش بڑھتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کرکے چھوڑوں گا

اس شعر میں آپ نے ظاہر کیا ہے کہ شاعر کی دور رس نگاہیں بہت کچھ دیکھتی ہیں۔ میں نے بھی بہت کچھ دیکھ لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں گا۔ جس سے تجھ کو حیرانی ہوگی اس بند کا آخری شعر ہے۔

جو ہے پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانہ کی طبیعت کا تقاضہ دیکھ لیتی ہے

خود کو فرماتے ہیں کہ ہم ان اہلِ بصیرت میں سے ہیں کہ تمام پردوں میں چھپے ہوئے رازوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ اور یہاں تک دیکھ لیتے ہیں کہ ہم کو یعنے

شاعروں کو یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اس وقت زمانہ کیا چال چلنا چاہتا ہے۔ اور کس رنگ پر چل رہا ہے۔ اس کے بعد اک فرد قوم سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں جس طرح اک معلم اپنے شاگرد سے یا اک باپ اپنے بیٹے سے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثال نقش پا تو نے

فرماتے ہیں کہ تو نے اپنی تمام عمر پستی میں بسر کی اور مطلق کوشش نہ کی کہ اس پستی سے نکل جاوں اور بلندی پر پہونچوں۔ فرماتے ہیں۔

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینہ میں اپنی ادا تو نے

یعنے اپنی تمام زندگی حسن بتاں پر دل فدا کرنے میں گذار دی اور ان کے حسن سے جو فائدہ اٹھانا چاہیئے تھا وہ نہ اٹھایا۔ اس میں جلوۂ حقیقی تھا اس میں تیرا عکس تھا۔ اس کو تو نے مطلق نہ دیکھا اور اس بلندی پر نہ پہونچا جہاں تجھے پہونچنا چاہیئے تھا۔

ان چند نظموں کے بعد آپ کی معدودے چند غزلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غزل گوئی میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا بلکہ قومی شاعری میں اپنی عمر کا زیادہ حصہ وقف کیا۔ لیکن غزلیں آپ نے جو دس پانچ یہاں درج فرمائی ہیں وہ غزلیں کیا ہیں نغمہائے معرفت ہیں۔

ب سے پہلے غزل گوئی میں آپ کا وہ رنگ پیش کیا جاتا ہے جس
کے ذریعہ سے آپ نے مرزا داغ دہلوی کا شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے
اور یہ دکھلا دیا ہے کہ سلیس اور عام فہم اور صرف لطف زبان حاصل کرنے
کے لئے اور اپنے استاد کی تقلید میں اس طرح کہتے ہیں۔ داغ کی زبان
اور ان کا رنگ ڈاکٹر اقبال کی اس غزل میں بدرجہ اتم موجود ہے بلکہ
میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر کسی شخص کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ ڈاکٹر
اقبال کی غزل ہے تو وہ سن کر فوراً رائے قائم کرے گا کہ حضرت داغ
میں۔ چنانچہ میں نے اس ہی طرح آپ کی اس غزل کے چند شعر اپنے ایک علم
دوست دوست کو سنائے اور دریافت کیا کہ آپ کو کچھ ان اشعار کے متعلق
علم ہے کہ کس کے ہیں؟ فرمانے لگے۔ کہ مرزا داغ دہلوی کے ہیں۔ میں
نے سوال کیا کہ آپ کو علم ہے آپ یقین سے کہتے ہیں۔ فرمانے لگے۔ کہ ان
کا رنگ ہے۔ ان کا طرز بیان ہے۔ ان کے تیور ہیں۔ زبان بتا رہی ہے
میں نے کہا نہیں یہ اشعار مرزا صاحب کے نہیں ہیں بلکہ ڈاکٹر اقبال
کے ہیں۔ میرے اس کہنے پر آپ بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ سبحان اللہ ڈاکٹر
اقبال کا یہ رنگ ہی نہیں۔ کبھی میں یقین نہیں کر سکتا۔ اتفاقاً میرے ہاتھ
میں بانگ درا تھی۔ یہ غزل نکال کر دکھائی۔ دیکھکر بہت متعجب ہوئے اور
کہنے لگے کہ بڑا کمال ہے، میں نے کہا کمال تو ہے ہی، لیکن آخر داغ کے شاگرد
تھے استاد کا رنگ دکھاتے یا نہ دکھاتے۔ یہ غزل کہہ کر آپ نے یہ بھی تو
دکھا دیا ہے کہ میں اپنے استاد کے رنگ میں بھی کہہ سکتا ہوں اور خوب کہہ سکتا

ہوں ۔ جہاں میں ادق پسندی سے کام لیتا ہوں اور اس رنگ پر قادر ہوں وہاں اس قدر آسان اور عام فہم زبان میں بھی کہہ سکتا ہوں فرماتے ہیں:۔

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی | مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا | خطا اس میں بندہ کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا | تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد | مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

چاروں شعر کا ایک ایک لفظ حضرت داغ دہلوی کے دماغ کی تصویر ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ داغ بول رہے ہیں۔

بہرحال ڈاکٹر اقبال نے اردو کلام میں اکثر غزلوں میں کہیں کہیں اپنے اردو کے استاد حضرت داغ دہلوی اور فارسی کلام میں فارسی استاد حضرت مولانا گرامی جالندھری کا رنگ جھلکایا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ میں ان ان استادوں کا شاگرد ہوں۔

چند شعر ایک غزل کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن میں صوفیانہ رنگ اور معرفت کی جھلک نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی | ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لب گویا پیام موت | اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر | ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن | دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشہ کرے کوئی

خود کو حسن حقیقی میں گم کر کے آپ نے یہ غزل فرمائی، اور استاد کے رنگ کو

ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ایک اور آپ کی بہت مشہور اور مقبول غزل ہے۔ جس کے متعلق لوگوں کو یہ صحیح علم بھی نہیں ہے کہ یہ ڈاکٹر اقبال کی غزل ہے جو معرفت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ آپ اس غزل میں حسن حقیقی کو مخاطب فرما رہے ہیں اور کس محبت اور جذبے سے شعر فرماتے ہیں۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں　　　مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

حقیقتاً انتہائی سادگی سے شعر کہا اور اپنی سادگی کا اظہار بھی فرما دیا کہ اے رب العالمین میں اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف تیرے عشق کی انتہا" یہ میں جانتا ہوں کہ ایک بندۂ ناچیز ایک بندۂ گنہگار اور پُر معاصی کا عشق اور وہ بھی خدائے تعالےٰ سے بہت دشوار اور بہت ہی مشکل شے ہے لیکن اپنی سادگی اور سادہ لوحی سے عرض کر دیا۔

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو　　　کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

یعنے جنت تو ان لوگوں کو درکار ہے کہ جو یہ خیال کر کے کہ جنت عبادت کرنے کے معاوضہ میں ملتی ہے عبادت اور زہد و تقوے میں زندگی بسر کرتے ہیں انہی کو مبارک رہے میں تو جنت کا طلبگار نہیں مجھ کو جنت کی ضرورت نہیں لیکن اگر چاہتا ہوں تو صرف دیدار اور تیرا دیدار اگر عشق اسی کا نام ہے کہ زہد و تقوے میں صرف جنت حاصل کرنے کے لئے زندگی بسر کیجائے تو کیا زندگی۔ ہاں جو منشا رحقیقی ہے وہ تو یہ ہے کہ نظریں حسن سے معمور ہوں اور دیدار دلدار ہو جائے۔ اس کے بعد اس ہی غزل میں فرماتے ہیں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

آپ اپنے مذکورۂ بالا اشعار کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ میں نے دنیا میں اپنی دلی آرزو جو کبھی نہ کہنی چاہیے تھی کہہ دی یہ حقیقتاً بارگاہ حسن اور ادب وفا کے خلاف ہے۔ لہٰذا محسوس کرتا ہوں اور خود کہتا ہوں کہ واقعی میں نے بے ادبی کی اور سزا کا مستحق ہوں اور اس سزا کے لئے تیار ہوں۔

بہرحال ڈاکٹر اقبال نے جو ابتدائی زمانہ میں غزلیں کہی ہیں۔ وہ بہت صاف اور سادہ اور مرزا داغ دہلوی کے رنگ میں، لیکن اپنے رنگ کو بھی کہیں کہیں شامل کر لیا ہے۔ یعنی بعض بعض جگہ ترکیبیں مرزا داغ سے بدل بھی گئی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

اس کے بعد آپ کی جذباتی نظموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو حصہ دوم کی صورت میں ہے اور زیادہ تر ولایت میں لکھا ہے جس کا رنگ حصہ اول کی نظموں اور غزلوں سے بالکل جدا ہے۔

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

یعنے موسم بہار جو حقیقتاً ایک چمن کے لئے حسن اور شباب ہے یہ سن کر چمن سے اپنی ناپائیداری اور بے ثباتی کا سوگ مناتا ہوا۔ نالاں و گریاں واپس چلا گیا۔ اور حقیقت حسن سے ان سب کو واقفیت ہو گئی کس قدر عبرت خیز نظم ہے اگر اس کی معنویت پر جایا جائے تو حقیقت ہے۔ کہ یہ دنیا جو مثل اک چمن کے ہے بالکل ناپائیدار اور بے ثبات ہے۔ سورج کا نکلنا اور غروب ہونا۔ چاند کا نکلنا اور چھپ جانا۔ صبح ہونی اور شام کو رات کی ظلمت کا اس پر مسلط ہو جاتا۔ انسان کا ہنسنا اور گریاں ہونا کیا ہیں۔ صرف دنیا کی ناپائیداری کا ثبوت اور دلیل ہر بہار کے بعد خزاں کا آنا ضروری ہے۔ اور ہر خزاں سے خداوند عالم ہے بہار کی بنیاد ڈالی ہے۔ ع

طرح رنگ آمیزی از فصل خزاں انداختہ

بہرحال زوال ہر شے اور ہر چیز کو ہے۔ زندگی دوام سوائے ذات باری کے اور کسی کیلئے نہیں۔

بانگ درا کا حصّہ سوئم

"شکوہ"

یہ ڈاکٹر اقبال کی شہرۂ آفاق اور مقبول نظم ہے جو انجمن حمایت الاسلام لاہور کے چھبیسویں اجلاس میں پڑھی گئی تھی اور بہت پسند کی گئی تھی۔ اس قدر ہر دل عزیز نظم ہے کہ ہر شخص اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اس نظم میں ڈاکٹر اقبال نے خدا کی درگاہ میں مسلمانوں کی طرف سے جو جو شکوے اور شکایات تھیں وہ کی ہیں خواہ وہ مناسب تھیں یا نہ تھیں بہر حال عالم و جاہل ہر مسلمان جو جو شکایات خداوند عالم سے رکھتا ہے وہ سب ڈاکٹر اقبال نے خدا کی درگاہ میں پیش کیں۔ اور ساتھ ساتھ اس کا بھی اعتراف کیا کہ میں خدا کی ذات سے شکوہ کروں میری کیا مجال، صرف میری تاب گویائی نے یہ جرأت کی ہے پہلا بند ہے۔

کیوں زیاں کار رہوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو ٭ شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

آپ نے شکوہ میں ایام جاہلیت کے اس دور کو خدا کی درگاہ میں پیش کیا ہے کہ جب مسلمان نہ تھے۔ اور سوائے کفر وظلمت کے کچھ تھا ہی نہیں۔

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

تجھکو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا ✤ قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

آپ فرماتے ہیں کہ اے خدا مسلمانوں سے پہلے تیرے جہاں کا منظر عجیب و غریب تھا کہیں تو پتھر کی پرستش ہوتی تھی اور کہیں درختوں کی پوجا۔ بہرحال خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر "پیکر محسوس" کا لفظ زیادہ قابل توجہ ہے یعنی اس زمانہ کے انسان وجود مادی کے قائل تھے اور "ان دیکھے" یعنی جس کو کبھی دیکھا ہی نہیں اس خدا کو نہیں مانتے تھے۔ تو تجھ کو کب کسی نے دیکھا تھا یا دیکھا ہے اس لئے تجھ کو کوئی جانتا ہی نہ تھا اگر تجھ کو منوایا۔ اور تیری خدائی میں تجھ کو خدا ظاہر کیا تو وہ صرف مسلمان کی ذات سے ان ہی مسلمانوں نے تیرے [illegible] خشکی اور تری میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکیوں میں ترے نام کو عالم میں روشناس کرایا۔ جہاں تیرے نام پہ ڈٹ گئے وہاں سے قدم نہ ہٹائے۔ اور دلوں پہ تیری توحید کا سکہ جما کر چھوڑا۔

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے ✤ زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

مثال میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی جنگوں کو اور ان کے دینی کارناموں کو یاد دلایا ہے کہ جو آپ نے صرف خدا کی ذات کے وجود اور وحدانیت کی روح پھونکنے کے لئے دنیا میں کفر سے کئے تھے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

تو ہی کہدے کہ اکھاڑا در خیبر کس نے ؟
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے .. ؟

توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے ؟
کاٹ کر رکھدے کفار کے لشکر کس نے ؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو ؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرہ یزداں کو ؟

مسلمانوں کی مالی کمزوری اور ناداری سے متاثر ہو کر آپ ذات باری سے خطاب کرتے ہیں۔ اور کس انداز کے ساتھ خطاب کرتے ہیں۔ کہ شاید قدرت خداوندی دیکھ ہی نہ آتی ہوگی۔

کیوں مسلمانوں پہ ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جسکی نہ حد ہے نہ حساب

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہ رو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب

طعن اغیار ہے، رسوائی و ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

فرماتے ہیں آپ۔ کہ اے رب العالمین مسلمانوں کو دولت دنیا سے کس
لئے محروم کر رکھا ہے۔ تیری قدرت تو بہت کچھ ہے۔ تیری قدرت کے
مقابلہ میں تو کوئی قدرت ہے ہی نہیں۔ اگر تو چاہے تو خشکی سے فوراً دریا
پیدا کرکے اپنی قدرت کاملہ کا مظاہرہ کرا سکتا ہے۔ ہم سے یہ اغیار
کے طعنے نہیں سنے جاتے۔ یہ رسوائی برداشت نہیں ہوتی یہ ناداری
نہیں دیکھ سکتے اس لئے کہ ہم تیرے فدائی اور تیرے نام پر جان قربان
کرنے والے ہیں اور تیرے نام پر قربان ہونے کا صلہ اور عوض ذلت و
خواری نہیں ہے۔

اس کے بعد آپ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ اور خدا سے دعا کرتے ہیں

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کردے　　مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کردے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کردے　　یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کردے

جوئے خوں می چکد از حسرت دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

اے رب العزت اب مسلمانوں پر رحم فرما اور انکی مشکلوں کو آسان کردے
اس لئے کہ وہ قادر مطلق ہے کہ اگر ناچیز چیونٹی کو چاہے تو سلیماں جیسی قوت
عطا کردے۔ ہم تمام مسلمان اب وہ مسلمان نہیں رہے ہم کو پھر مسلمان کہلانے
کا مستحق کردے۔ تاکہ تیرے چاہنے والے اور تیرے فدائی کفار کے مقابلہ
میں کچھ نمایاں نظر آئیں اور کفر کے سامنے ایماں اور اسلام کی بے عزتی نہ
ہو۔ اس کے بعد آخری بند میں فرماتے ہیں کہ اے خداوند عالم یہ میرے

اشعار دلوں پر اور وہ بھی مسلمانوں کے دلوں پر اثر کریں اور کچھ ایسا اثر کریں کہ خواب غفلت سے بیدار کر دیں۔ ؎

جاگ اس بلبل تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگ درا سے دل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہد وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

یہ آپ کی وہ مشہور نظم ہے۔ جو آپ نے شکوہ کے جواب میں رب العزت کی طرف سے لکھی ہے اور مسلمانوں کی نااہلی اور بداعمالی کو ظاہر کرتے ہوئے تمام شکایتوں کا جواب دیا ہے اور مسلمانوں کو بتا دیا ہے کہ تم اس حالت میں اب بھی بہتر ہو ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اب مسلمان اس قابل بھی نہیں کہ ان کو اتنا بھی جاہ وحشم عطا کیا جائے جتنا اس وقت دے رکھا ہے آپ شکوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اور جواب شکوہ کا آغاز کرتے ہیں پہلے بند کا تیسرا شعر ہے ؎

اُڑ کے آواز مری تا بہ فلک جب جا پہونچی
یعنی اس گل کی مہک عرش تلک جا پہونچی

اس کے بعد تیسرا بند اس طرح فرماتے ہیں اور جواب شکوہ کی گریز کرتے ہیں۔ سہ

پیر گردوں نے کہا سن کے ،، کہیں ہے کوئی
بولے سیارے سر عرش بریں ہے کوئی

چاند کہتا تھا نہیں اہل زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ نہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوہ کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

آپ آسمان کا ایک فرضی نقشہ کھینچتے ہیں کہ جب شکوہ کی آواز آسمان پر پہونچی تو وہاں کیا کیفیت ہوئی۔ آواز "شکوہ" پر فرشتوں کو حیرت اور تعجب ہوا کہ یہ آواز کیا اور کس قسم کی ہے اور کہاں سے آرہی ہے وہ پریشان تھے کہ تمام عرش والوں کو نہیں معلوم کہ یہ کیا بھید ہے۔ آواز انسان کی ہے۔ کیا انسان کی طاقت پرواز اس قدر بڑھ گئی۔ کہ وہ عرش تک پہونچنے لگا۔ اگر ایسا ہے تو تعجب یہ ہے کہ انسان اور اس قدر بے ادب اور گستاخ۔

عاشق اور بے ساکن زمیں کیسے ہیں،
شوخ گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

گریز کا آخری بند مذکورہ شعر سے ربط رکھتا ہے جس طرح یہ شعر آپ نے فرشتہ کی زبان سے فرمایا ہے اس ہی طرح یہ آخری بند بھی فرشتے ہی کی طرف سے فرمایا ہے۔ فرشتہ، صاحبِ شکوہ کو معترض الفاظ سے اور حقیر نظروں سے یوں دیکھتا ہے۔ فرماتے ہیں

اسقدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے

عالمِ کیف ہے دانائے رموزِ کم ہے
ہاں۔ مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

اس بند پر آپ نے جواب شکوہ کی گریز ختم کر دی ہے اور اس کے بعد آوازِ غیب کی صورت میں جواب دیئے ہیں۔ اور مسلمانوں کو قدرت کے وہ وہ پیغام پہونچائے ہیں کہ اگر اس وقت صحیح صورت میں مسلمان جوابِ شکوہ پر عمل کریں تو مکمل مسلمان ہو جائیں۔ قدرت کی طرف سے فرماتے ہیں۔ اور اس طرح آغاز کرتے ہیں۔

آئی آواز۔ غم انگیز ہے افسانہ ترا — مئے فریاد سے معمور۔ ہے پیمانہ ترا
ہے ہم آغوشِ ملک نعرۂ مستانہ ترا — کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا

شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندے کو خدا سے تو نے

اس گریز اور اس ابتدائی جواب شکوہ کے بند سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے شکوہ کی بیباکی کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا یا یہ کہ وہ بیباکی اس جواب شکوہ کے تصور میں جان کر کی تھی۔ اس لئے کہ دنیا جو قدرت سے یہ بے تکی شکایتیں دن رات کرتی ہے اور اپنے عیب نہیں دیکھتی اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ دربار باری میں گستاخی اچھی نہیں اور آئندہ اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور جواب شکوہ پر عمل کرنا اپنا فرض خیال کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کا ہر ہر بند اپنے مقام پر احکام الٰہی کا ترجمہ ہے۔ شکوے کے اس موقع کا جہاں مسلمانوں کے احسان بتلائے گئے ہیں۔ اور رسول مقبول کی امت خود کو ظاہر کیا گیا ہے۔ جواب دیا ہے کہ واقعہ ہے کہ احمد مختار ؐ تمام نبیوں کے امام تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی امت بھی ان کی طرح تمام قوموں کی سردار ہے۔ لیکن میں تو تم مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں خیال کرتا کیوں اس لئے۔

اس کی امت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں
ہے جو اسلام کی ہوتی ہے وہ اس خم میں نہیں

اس کے بعد آپ خدا کی طرف سے اس موقع کا کتنا بہتر جواب تصنیف فرماتے ہیں کہ جہاں شکوہ میں آپ نے لکھا ہے کہ ہم نے دنیا سے نقش باطل کو مٹایا۔ ہم نے نوع انساں کو غلامی کے پھندوں سے آزاد کیا۔ ہم نے تیرے کعبہ کو جبینوں سے سجایا، ہم نے تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا۔ فرماتے ہیں۔

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟   نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا کس نے؟   میرے قرآن سینوں سے لگایا کس نے؟

تھے تو آباء ہی تمہارے وہ، مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ رکھے منتظرِ فردا ہو"

یا شکوے کے اس موقع کا مسلمانوں کو جواب دیا ہے، بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے، کہ ایک دن وہ تھا کہ تمہارا ہی خدا رعنائی مکمل اور مرکز تصور کرتا تھا اور ہر شخص اس کو اپنا محبوب حقیقی تصور کرتا تھا جس کو آج تم لفظ ہرجائی سے یاد کر رہے ہو تو۔

کس یکجائی سے اب عہد غلامی کر لو
ملت احمد مرسل کو مقامی کر لو

اس کے بعد۔ مسلمانوں کی مذہبی اور احکام خداوندی کی تکمیل نہ کرنیکی حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ظاہر کیا ہے کہ تم شکایت کس بل بوتے پر کر رہے ہو تم اسوقت میرا کونسا حکم بجالا رہے ہو۔ میرے اوپر کون سا احسان کر رہے ہو۔ "روزہ" سے تم کو مطلب نہیں، نماز سے تم کو واسطہ نہیں آپ فرماتے ہیں

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے "ہاں نیند تمہیں پیاری ہے"
طبع آزاد پہ قید رمضاں بھاری ہے"
تمہیں کہہ دو یہی آئین وفاداری ہے

اسی طرح تمام "شکوہ" کی شکایتوں کے جواب اس قدر باسلیقہ مناسب اور ضروری دیئے ہیں کہ مسلمانوں کو "جواب شکوہ" پڑھکر ڈوب مرنا چاہیئے۔ کہ مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں اور اپنی بداعمالیوں اور بدکاریوں پر نظر نہیں کرتے اور غیر قوموں کی بہتر حالت کو دیکھکر کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے مسلمانوں کی حالت خراب کر رکھی ہے اور اپنے دشمنوں کو اس طرح نوازرکھا ہے۔

بالِ جبریل

بالِ جبریل ڈاکٹر اقبال کی وہ مکمل اور مفصل تصنیف ہے جو از اوّل تا آخر فلسفے ہی فلسفہ پر مبنی ہے، اور آپ کے اردو کلام اور تصانیف میں ایک خاص امتیاز کی مالک ہے۔ از ابتدا تا انتہا اگر اس کے ایک ایک شعر کو اس میں گم اور حل ہو کر اپنے دماغ اور دل کو اس کے لئے وقف کر کے دیکھا جائے تو پتہ چلیگا کہ اس کا ایک ایک شعر بجائے خود ایک فلسفہ ہے اور مکمل درس ہے جن کے مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر اقبال کے بلند خیال اور فلسفی ہونے کا صحیح ثبوت ملتا ہے"

اس کتاب کو حقیقتاً اگر "فلسفۂ اقبال" کے نام سے موسوم کر دیا جائے تو ہرگز بیجا نظر نہ آئے گا۔

بالِ جبریل میں ڈاکٹر اقبال نے اگر بنظر غور دیکھا جائے تو ہر نظم میں خواہ وہ کسی موضوع پر ہو اپنے فلسفہ کو نہیں چھوڑا

اقبال فلسفۂ خودی میں غرق اور چور تھے اور اس کو اپنی شاعری کا جزوِ اعظم تصور کرتے تھے۔

کہیں آپ "خودی" سے مخاطب نظر آتے ہیں اور کہیں خودی کو خود سے ہم کلام ہوتے دکھاتے ہیں کہیں "خودی" سے دوسروں کو روشناس کرایا ہے تو کہیں دوسروں سے خودی کو آگاہ کیا ہے۔ کہیں خودی کو خدا

ظاہر کیا ہے اور کہیں " خدا سے " متعلق ، کہیں اس کو توحید تصور کیا ہے تو کہیں توحید کے متعلق ایک علیحدہ شے ، بحر حال ڈاکٹر اقبالؔ فلسفۂ خودی میں ڈوبے ہوئے تھے اور خودی ہی کو اپنا خاص موضوع تصور کرتے تھے

خودی کو وہ زندگی سے تعبیر کرتے تھے اور زندگی کو لفظ عشق سے یعنی آپ کے یہاں لفظ خودی زندگی اور عشق مترادف اور ہم معنے الفاظ تھے اس ہی لئے اقبالؔ خواہ فرشتوں سے ہمکلام ہوں خواہ خدا سے ، خواہ خود سے خطاب کر رہے ہوں ۔ خواہ حسن و عشق سے ، خواہ مسئلہ توحید میں غرق ہوں ، خواہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ، خواہ مولویوں کے اور واعظوں کی محفل وعظ میں ہوں ، خواہ شاعروں کے جھرمٹ میں ۔ وہ اپنے موضوع سے ہٹتے ہوئے نظر نہیں آتے ۔ آئینہ ایک ہے ۔ صورتیں مختلف ہو رنگ ایک ہے اشیا جدا جدا ۔ ساز ایک ہے ۔ نغمے علیحدہ علیحدہ "

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خوبی بھی ہے کہ ہر جگہ اور ہر پہلو سے اس لفظ کو اور اس فلسفہ کو اس قدر حسین ترین صورت میں پیش کیا ہے ۔ کہ طبیعت سیر نہیں ہوتی ۔

بال جبریل میں کیا ہے

بال جبریل کے اندر یہ بتانا کہ کیا کیا ہے میرے خیال سے ا* مشکل ہی ہے ،اس لئے کہ بال جبریل گنجینۂ علم ہے۔ اور فلسفہ کا بحر زخار۔ لیکن عام طریقے سے اس میں حسب ذیل موضوعات جگہ جگہ اور نئے نئے انداز سے نظر آتے ہیں۔

(۱) معرفت اور عشق خدا ورسول اور ان کی حمد و نعت۔

(۲) خداوند عالم سے نیازمندانہ شکوہ و شکایت

(۳) مذہبی اور قومی جذبہ جو مسلمانوں کا جوہر مستقل ہے اور لازوال دولت۔

(۴) نام نہاد مولویوں اور ملاؤں و اعظموں کی نقاب کشائی اور حقیقت کی وضاحت۔

(۵) وجود، ظاہر و باطن، علم وعمل، توکل اور محبت لازم و ملزوم شکل میں

(۶) ماضی کی یاد اور مستقل بینی۔

(۷) مغربی اور مشرقی تخیل کا صحیح اشتراک

وغیرہ وغیرہ۔ موضوع اور عنوان بال جبریل میں جا بجا نظر آتے ہیں اور ان ہی موضوعات سے متاثر ہو کر اور جذبات و کیفیات میں گم ہو کر ڈاکٹر اقبال نے جوہر علمی کے بہتر سے بہتر باب کھولے ہیں۔ جو کچھ ہے جذبات حقیقی اور آپ کے احساسات دل کا آئینہ ہے۔ جو الفاظ کی صورت میں منتشر نظر آتا ہے۔ اور شعر

کی صورت میں پڑھا جاتا ہے:

"عشق خدا اور انسان"

"ڈاکٹر اقبال خلافت باری تعالےٰ سے مخاطب ہیں کہ اے پروردگار عالم میں جو کچھ تجھ سے کہنا چاہتا ہوں وہ کسی دادطلبی کے جذبے کے ماتحت نہیں کہنا چاہتا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اسکو تو سن لے خواہ وہ مقبول بارگاہ ہو یا نہ ہو۔ بہر حال اک فریاد ہے اور تیرے بندے کی۔ جس کو تو نے انسان بنایا ہے اور اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ آزادی دی ہے اور خودمختاری عطا کی ہے

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

میں جانتا ہوں کہ تو نے مجھ کو خودمختار کیا جس کی وجہ سے میں نے آزادی کے رنگ میں خطائیں کیں اور گناہ کئے۔ اور قصوروار ٹھہرایا گیا۔ لیکن اگر میں گنہگار رہتا تو فرشتوں نے بھی تیرے خرابہ کو آباد نہیں کیا۔ وہ تو گنہگار نہیں تھے خطاوار نہیں تھے۔ فرماتے ہیں۔

قصوروار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!

کیونکہ نہ آباد کر سکے۔ صرف اس لئے کہ یہ شے ان کے بس کی ہے ہی نہیں وہ عشق کی حقیقت سے واقف نہیں انکا اتنا حوصلہ اور قوت نہیں یہ

تو کچھ انسان ہی کو زیب دیتا ہے اور اس ہی کے بس کا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
اُنھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

لہٰذا مجھ کو اپنا عشق عطا فرما دے اور محبت دے دے کیونکہ میں اس کا صحیح وارث ہوں اور جائز حقدار۔

خدا اور بندے کے عشق کی حقیقت

آپ خداوند عالم اور بندے کی پائیداری اور ناپائداری کے ساتھ عشق کی حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا!
کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا!

بندہ کی ذات فانی ہے اور خدا کی ذات لازوال کاش بندے کو بھی عمرِ دوام ہوتی اور اس کے بعد عشق کا رنگ اور محبت خدا دیکھتا۔۔ اس کے بعد خود کے متعلق کہتے ہیں۔

میری بساط کیا ہے؟ تب وتابِ یک نفس
شعلے سے بے محل ہے الجھنا شرار کا

یعنی میں انسان ہوں اور انسان کی زندگی صرف ایک سانس پر منحصر ہے اگر سانس ہے تو زندہ ہے ورنہ موت کی آغوش میں ہے۔ پھر ایسی حالت میں کیا عشق ہو۔ دوسرے یہ کہ تو اک شعلہ کی مانند ہے اور میں ایک

شرارہ ہوں پھر شعلہ کا شرارا مقابلہ کس طرح کر سکتا ہے۔
اس کے بعد آپ خداوند عالم سے التجا کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دل بیقرار کا

اے پروردگار عالم مجھ کو زندگیٔ دوام عطا کر کے دیکھ کہ میں کس طرح عشق و محبت کر سکتا ہوں۔

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

اے خالق عالم ایسا کانٹا ہو کہ جس کی کھٹک ہمیشہ ہمیشہ رہے۔ اور فنا نہ ہو اور اس کا درد دل میں ایسا پیدا ہو کہ جو کبھی زوال پذیر نہ ہو اور اس کی کسک قائم و دائم رہے۔ تاکہ عشق کا لطف ہمیشہ موجود رہے اور تیری محبوبیت رنگ لائے اور ہمارا ذوق و شوق۔

معرفت اور یاد رسولؐ

آپ رسول مقبول صلعم کو ساقیٔ حقیقی کہتے ہوئے معرفت مں جذباتی اور کیفیاتی شعر فرماتے ہیں۔

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو ٭ پلا کے مجھ کو مئے لا اِلٰہ اِلّا ہُو

فرماتے ہیں کہ رسولِ عالم نے جو میرے مسیح اور حقیقی ساقی تھے تمام ترحجابات کو درمیاں سے ہٹا دیا اور مجھ کو نورِ حقیقی میں اور نورِ حقیقی کو مجھ میں کچھ اس طرح حل کیا کہ من و تو کا امتیاز نہ رہا۔ یہ کس طرح اور کسی صورت سے لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوْ کی شراب پلا کر۔

خدائی اور بندگی

آپ بندگی اور خدائی کی حقیقت کو کس قدر واضح اور پر اثر صورت سے ظاہر فرماتے ہیں۔

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے | خداوند خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ | یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

دو مصرعہ خدائی کے متعلق اور دو مصرعے بندگی کے متعلق۔ فرماتے ہیں خدائی کیا چیز ہے تمام خشک و تر کے اہتمام اور انتظام کو خدائی کہتے ہیں جو اے خداوند عالم ایک دردِ سر سے کم نہیں کہ تمام خشکی اور تری کی ہر بات اور ہر فعل کا مختارِ کل اور منتظم اور اس کے بعد بندگی یہ اس سے بھی مشکل اور سخت چیز ہے وہ تو دردِ سر ہی ہے۔ یہ دردِ سر نہیں بلکہ دردِ جگر ہے۔

دوسری جگہ اس طرح فرماتے ہیں۔

تری دنیا جہاں مرغ و ماہی | مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور | مری دنیا میں تیری پادشاہی

یہاں آپ نے خداوند عالم کو مخاطب کر کے اپنی مجبوری اور لاچاری کا اظہار

کیا ہے اور اس کی قدرت اور حکومت کو روشن۔ یعنے اے خداوند عالم تیری دنیا آسمان و زمین اور اس سے بالاتر اور زمین کے تمام خشک و تر تک ہے اور میری دنیا صرف ایک صبح کی آہ کی مانند ہے کہ زبان سے نکلی اور غائب تیری دنیا میں میں ہوں اور مجبور اور لاچار اس لئے کہ میری دنیا میں تیری بادشاہی ہے اور تیری دنیا میں آزادی ہے اور خود مختاری اس لئے اس میں مجھ جیسی بے بس مخلوق ہے۔ اور تیری قدرت کی محتاج۔

بارگاہ خداوندی

اور

اقبال

ڈاکٹر اقبال بارگاہ رب العزت میں بیباک اور چہیتے بچے کی صورت میں پہونچتے ہیں اور ان کو اپنی کہنے اور دوسرے کی سننے میں کوئی خوف کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ یہ رنگ آپ کا خاص رنگ تھا۔ جو آپ کی تصانیف میں جا بجا پایا جاتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی!
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی!

یعنی یہ کہ میں نے "شکوہ" کیا اور تجھسے اس میں سب کچھ کہا اور اس پیرائے اور انداز سے کہا کہ جس کے متعلق خیال کرتا تھا کہ تجھ کو میرا خیال ہوگا اور میری عرضداشت تو قبول کرے گا لیکن اے خداوند عالم میں اپنی حالت میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ اور میری بدنصیبی بدستور اور تیری بے نیازی اور لاپرواہی بدستور،

ایک جگہ کہتے ہیں اور اس ہی انداز اور اپنے خاص شکایت کے رنگ میں کہتے ہیں۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سو

جنوں اک ایسی چیز ہے جس کی کوئی بات قابل گرفت نہیں ہوتی اس لئے آپ نے اس شعر میں لفظ جنوں ضرورتاً استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے خداوند عالم تجھ سے میرے جنوں کو گلہ ہے یعنے یہ کہ میں تجھ سے مجنونانہ حالت میں شکایت کر رہا ہوں کہ تونے مجھ کو اس عالم محدود میں کیوں قید کر رکھا ہے میں آخر تیرا بندہ ہوں تو جب خود آزاد ہے تو تیرے بندے بھی آزاد ہونے چاہئیں۔ تو تو عالم کون و مکان اور اپنی خدائی کے ذرّے ذرّے اور چپے چپے مالک آزاد ہے لیکن مجھ کو صرف اس فانی دنیا تک محدود و مجبور کرکے چھوڑ دیا ہے۔

زیادہ تر اقبال شکوے شکایات میں پھنسے ہوئے پائے جاتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا کی خدائی پر اعتراض ہے اور یہ قابل

الزام ہیں کہ خدا سے اس قدر بیباکی اور صفائی سے ہمکلام ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ آپ نے اپنی شاعری کا ایک انداز مقرر کرلیا تھا۔ ورنہ بات وہی ہے جو دوسرے لوگ اور انداز سے کہتے ہیں۔ ورنہ اس کے علاوہ دوسرے اور برعکس انداز میں بھی فرماتے ہیں۔

تری بندہ پروری سے مری دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایت زمانہ

اس ہی طرح ایک جگہ آپ اپنی مجبوری اور لاچاری کو اور خدا کی قدرت حقیقی کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے، سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے، اس شے کی نگہبانی۔

یعنے انسان کے جسم میں مادی اجزا کے علاوہ ایک شے ہے جس کو روح کہتے ہیں۔ جو تیری امانت ہے جسکی حفاظت اور نگہبانی میرے لئے دشوار ہے یعنے یہ کہ اس پر میں قابو نہیں رکھتا، تو جب چاہے اس کو میرے جسد خاکی سے علحدہ کرسکتا ہے اور میں اس کو نہیں روک سکتا۔

اس کے بعد اپنی بیباکیوں اور زبان درازیوں کا احساس کرتے ہوئے ایک جگہ اپنا مقطع اس طرح بھی فرماتے ہیں۔ اور اپنے کو گستاخ ظاہر کرتے ہیں۔ سہ

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اعتراف جرم سے جرم کی حقیقت کم ہو جاتی ہے۔ اس ہی لئے ڈاکٹر اقبال نے بھی اپنا یہ مقطع لکھا ہے اور بارگاہ الٰہی میں اپنی گستاخیوں کی معافی مانگی ہے۔ آپ اپنے متعلق فرماتے ہیں۔ کہ یہ عجب زبان دراز بندہ ہے کہ خدا کے حضور میں بھی خاموش نہیں۔ کیا ایسا انسان کوئی نہیں جو اس بندۂ بیباک کی زبان بند کر سکے۔ کاش اس کی زبان کو کوئی بند کرتا۔ تاکہ یہ اپنی زبان درازیوں اور گستاخیوں سے باز آتا۔

ایک جگہ آپ نے اپنے شعر میں اس طرح بھی اپنی بیباکی کے متعلق اظہار خیال کیا ہے فرماتے ہیں۔

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے

اقبال بارگاہ نبوی میں

ڈاکٹر اقبال جس انداز سے خدا کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہ واضح ہو کہ ایک لاڈلے بچے کی صورت سے اور ایک محبت کے انداز سے پہونچتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی امر قابل غور ہے کہ بارگاہ نبوی میں انتہائی ادب اور تہذیب سے قدم رکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس بارگاہ سے خاص لگاؤ ہے۔ لیکن خوف کے ساتھ ساتھ، اور خوف بھی کیوں نہ ہو، خدا کے پاس آپ جاتے ہیں اپنی عرض

گزارنے اور وہاں جاتے ہیں۔ برکت اور محبوب خدا اور اپنا پیشوائے اعظم خیال کرکے، حضورؐ کے متعلق جو شعر آپ نے کہا ہے۔ وہ انتہائی ذوق وشوق میں ڈوب کر۔ اور اس ذوق کو واضح اور ظاہر کردیا ہے جیسا کہ فرماتے ہیں۔

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق وشوق
دل میں صلوٰۃ درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

حضور نبوی میں آپنے اپنے اعتقادات اور جذبہ کا اظہار فرمایا ہے۔ کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں اور یہاں کی کفر نوازی حد سے گذر چکی ہے لیکن میں پھر بھی اس ماحول سے بچ کر تیرے ذوق وشوق میں مست ہوں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے دل میں بھی صلوٰۃ اور درود ہے اور لب پر بھی۔ میرا ظاہر و باطن تیرے عشق سے چور اور پر ہے۔

"حدیث لولاک"

خداوند عالم نے لولاک لما کہکر رسول مقبول ص کی ذات کو جس قدر بلند فرمایا ہے کسی نبی اور کسی پیغمبر کی ذات کو نہیں فرمایا۔ جس قدر اعزاز اس فرمان کے ذریعہ آپ کو عطا فرمایا ہے کسی کو نہیں عطا کیا۔ قدرت جب اپنے حبیب کے عشق میں محو اور جوش میں آتی ہے۔ تو کہہ دیتی ہے کہ اے محمد ص یہ واقعہ ہے کہ میں اگر تم کو نہ پیدا کرتا تو نہ پیدا کرتا ان افلاک کو

اس ہی لئے تمام شاعر آپ کو باعثِ کون و مکان لکھتے ہیں۔ اور رحمت للعالمین کے خطاب سے یاد کرتے ہیں آپ اس حدیث شریف سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

واضح یہ کرنا ہے کہ یہ تمام عالم صاحب لولاک کا ہے اور ہر مومن صاحب لولاک ہے۔ اس لئے کہ ہر مومن رسول کی امت سے ہے اور صاحب لولاک رسول اقدس ہیں۔ ان کے بعد ان کی ہر چیز کے مالک ان کی امت اور مومن ہیں لہذا یہ جتنا عالم ہے سب مومنوں کا ہے اور کسی کی میراث نہیں۔ اس ہی خیال کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے۔

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

معراج مصطفوی

جب سے آپ کو معراج ہوئی ہے آجتک جس قدر شاعر گذرے ہیں سب نے معراج کے لئے کچھ نہ کچھ لب کشائی اور خامہ فرسائی کی ہے۔ نئے نئے اور انوکھے انداز سے اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے معراج کے ثبوت میں تو شعر نہیں فرمایا لیکن ان سے

دوسرا فائدہ اٹھایا اور ایک حسین پہلوِ شاعرانہ نکال کر یہ شعر کہا ہے

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

آپ فرماتے ہیں کہ مجھ کو جناب رسول مقبول کی معراج کے واقعہ سے یہ پتہ چلا ہے کہ آسمان تک انسان کی رسائی ہے اور عالم بالا تک پہونچنے کے لئے آسماں مانع نہیں ہو سکتا۔

دربارِ مصطفوی میں التجا

ایک موقع پر اقبال جناب رسول مقبول سے اس طرح التجا اور گذارش کرتے ہیں۔

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

یعنے یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اے مولائے کل آپ خود چارہ سازی فرما دیجئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہاں کی تہذیب افرنگی ہے اور تمدن کفر ہے۔

اصحابِ رسولؐ

آپ حبیب خدا اور محبوب خدا محمد مصطفیٰ ؐ کی ذوات کے بعد نظر کرتے

ہیں تو اصحاب رسولؐ کی ذاتیں روشن نظر آتی ہیں۔ جن کے کمالات اور اعجاز کا اظہار جگہ جگہ فرماتے ہیں۔ اور مذہب کو ان کی طرف متوجہ فرما کر اس سے سبق حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

دلِ بیدارِ فاروقی، دلِ بیدارِ کرّاری
مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

اس شعر میں آپ حضرت عمرؓ اور حضرت امام علی کرم اللہ وجہ کے قلوب روشن او بیدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ تمول اور امارت حاصل ہونے کے بعد، عام طریقے سے دل بیکار سا ہو جاتا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت علیؑ کی شاہی اور امارت حاصل کر کے بھی اگر دل بیدار ہے تو انسانی کوتاہیوں اور خامیوں کے مس کے لئے، ہی دل کی بیداری کیمیا سے کم نہیں۔

ایک جگہ اس طرح فرماتے ہیں

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

وہ مرد فقیر جس کی فقیری میں اسد اللّٰہی کی بُو یعنے قوت اسد اللّٰہی موجود ہو۔ وہ دارا و سکندر سے لاکھ درجہ بہتر ہے، اس لئے کہ دارا و سکندر دبدبہ اور سطوت میں یقیناً ایک امتیاز کے مالک تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ ان میں سوائے بادشاہی کرنے کے جذبہ کے اور عیش دنیاوی میں زندگی بسر کرنے کے خیال کے اور کچھ نہ تھا۔ بر خلاف اس کے

چونکہ اسد اللّٰہی قوت اور شان ایسی شان تھی۔ کہ اس سے بہتر خدا نے کسی کو عطا نہیں کی اس لئے اگر کسی فقیر میں بھی ذرا سی بو حضرت علیؑ کی آجائے تو وہ ان دارا و سکندر سے لاکھ درجہ بہتر ہے اس لئے۔ کہ آپ دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ صرف خدا کے کام میں مصروف تھے۔ اور آپ کی کل قوت اللہ کے کام کے لئے تھی اور اور آپ کو اسد اللہ یعنے اللہ کا شیر کہا جاتا ہے

شانِ نبوی

شان محمد مصطفےٰ میں آپ لب کشائی فرماتے ہیں اور ظاہر فرماتے ہیں کہ آپ مولائے کل ہیں۔ تمام عالم آپ کی مولائی کے محتاج ہیں

وہ مولائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

کیا شان ہے کہ کل عالم کا مولا اور آغا خاتم الانبیا اور خاتم المرسلین جس نے غبار راہ کو وادیٔ سینا کا اعزاز بخشا۔

نگاہ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہا

میری محبت کی نظر۔ اوّل سے آخر تک، چپہ چپہ پر ذرہ ذرہ میں قطرہ قطرہ میں آپ کا جلوہ دیکھتی ہے۔ تمام عالم میں آپ ہی کا نور ہے اور آپ ہی کا حسن۔ اس لئے کہ خداوند عالم نے قرآن آپ پر نازل کیا۔ یٰسین آپ کی

شان میں آئی اور طٰہٰ آپ کو خطاب کیا۔
طٰہٰ کہا گیا۔ کہیں لٰیٰسین کہا گیا۔
کتنے حسین سے ہیں انہیں کو خطاب دیکھ

(مولف)

بہرحال دنیا آپ سے ہے زمین آپ سے ہے آسمان آپ سے ہے آپ کی شان ارفع اور اعلیٰ نہ ہو تو کیا معنے یہ وہ ذات ہے کہ اس سے بہتر نہ خدا نے کوئی خلق پیدا کی اور نہ پیدا کرے گا۔

فلسفہ شہادت

ڈاکٹر اقبال فلسفۂ شہادت کو اس طرح بے نقاب اور اس طرح واضح اور روشن فرماتے ہیں۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

مقام شبیری یعنے شہادت ایک ابدی چیز ہے جو ہمیشہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ شہید کبھی مرتا نہیں اس کو عمر ابدی حاصل ہوتی ہے اور بالکل اس ہی طرح زندہ رہتا ہے جس طرح ہم لوگ لیکن ان کیلئے ایک مقام علیحدہ جو یہاں سے بہت افضل و اعلیٰ ہے ان کو شہادت کے معاوضہ میں عطا ہو جاتا ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔
دوسرے پہلو اس شعر کے یہ بھی ہیں کہ شہادت ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اس کے انداز بدلتے رہتے ہیں لیکن چونکہ کوئی

شہادت امام حسینؓ سے بڑھ کر کسی کو نصیب نہیں ہوئی اس لئے ان کے نام سے
موسوم کیا ہے، جب سے آپ کو سید الشہداء کہتے ہیں۔ مقام شبیری سے مراد
حق ہے اور انداز روباہی و شامی سے وہ لوگ جو حق کے مقابل آتے ہیں
ایک اور جگہ شہادت کے سلسلہ میں اس طرح فرماتے ہیں۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیل

شہادت کی داستان انتہائی سادہ ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ غریب
بھی ہے، اور رنگین بھی، لفظ رنگین شہداء کے خون کی رعایت اور لفظ
غریب: شہداء پر ظلم و ستم اور درد و مصائب جو ان پر کئے گئے ہیں ابتدا
شہادت کی حضرت اسماعیل سے شروع ہوتی ہے اور انتہا اس کی
حضرت امام حسینؓ پر یعنی یہ کہ شہادت کو ازلیت اور ابدیت کی وسعت
حاصل ہے۔

جاہ طلب صوفی اور مولوی

یہ موضوع بھی ڈاکٹر اقبال کا خاص موضوع ہے اور اس کو جہاں تک
میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے مکمل اور مفصل طریقے سے اچھے اچھے انداز
اور اچھوتے انوکھے عنوان سے جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ اگر کل تصانیف میں
اپنے آپ سے صرف اسی موضوع کے اشعار انتخاب کئے جائیں۔ تو بہت
سے مل جائیں گے۔ انہوں نے جاہ طلب صوفی اور ریاکار نام نہاد مولوی

اور پیروں کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

یہ پیران کلیسا و حرم ہائے وائے مجبوری
صلہ ان کی کدو کاوش کا ہے سینوں کی بینوری

مطلب آپ کا یہ ہے کہ یہ جتنے مولوی اور صوفی، ور پیر و مرشد ہیں یہ سوائے اپنے حلوے مانڈے کے اور کوئی مشیت نہیں رکھتے اور ان کی جتنی کدو کاوش ہے وہ سب انکی لئے ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کے کلام ان کی بات میں ان کے فعل میں ان کے وعظ میں کوئی اثر نہیں برخلاف اس کے سینے بے نور اور مکدر ہیں، اس لئے ان سے صاف قلب اور سیدھے سادے مسلمانوں کو۔۔۔ اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اے مسلمان اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

ایک جگہ ڈاکٹر اقبال صوفی کی حقیقت اور اصلی صوفیت کو یوں ظاہر کرتے ہیں

حلقۂ صوفی میں ذکر، بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام، تو رہا تشنہ کام

نام نہاد صوفیوں سے ہر مسلمان کو آگاہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اب صوفی کے اذکار میں نہ سوز و گداز ہے اور نہ گریہ ہے۔ اسی وجہ سے میں اس کی ذات سے کوئی فائدہ نہ حاصل کر سکا۔ اور نہ کوئی اور مسلمان۔

ایک جگہ اور اس طرح فرماتے ہیں۔

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

یعنے اب وہ صوفی نہیں ہیں۔ جن میں کرامات کی روشنی اور معجزات کی فراوانی ہو اب تو وہ صوفیوں کے قصے باقی ہیں۔ جو پہلے صاف قلب اور حقیقی صوفیوں کی کرامات کے فضا میں پھیلے ہوئے تھے اور ایک جگہ اس سے بھی زیادہ آپ صاف اور بہت صاف فرماتے ہیں۔ اور ظاہر کرتے ہیں کہ صوفی اور ملا بجائے اس کے کہ خداوند عالم کو خوش کریں اور شرمندہ کریں گے۔ فرماتے ہیں۔

کرے گی داور محشر کو شرمسار ایک روز
کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

چونکہ صوفی اور ملا اپنے کو خدا کا نام لیوا اور دین صحیح کا ہادی اور تابع ظاہر کرتے ہیں اور کام کچھ نہیں کرتے اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ قیامت کے روز داور محشر یعنے خداوند عالم ان کو دیکھ کر شرمسار ہوگا کہ یہ میرے بندے وہ فریبی اور چالاک بندے ہیں کہ جو سیدھے سادھے مسلمانوں کو مذہبی پیشوا کی صورت سے پریشان کرتے تھے اور ان کو دھوکہ دیتے تھے۔

ملا اور بہشت

یہاں اقبال نے ایک پہلو اور نہایت اندازسے ملا کی حقیقت سے روشناس کرایا ہے۔

نہیں فردوس مقام جدل وقال واقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

آپ فرماتے ہیں کہ اگر ملا کو جنت میں داخل کیا گیا تو یہ وہاں سے

رخنہ اندازی کے اور کچھ نہیں کرے گا اس لئے کہ یہ اس کی سرشت ہے کہ جہاں یہ بیٹھتا ہے وہاں بحث و تکرار کرتا ہے۔ ع

خوش سؔ آئیں گے اے حور و شراب ولب کشت

یہ وہاں بھی اپنے بے جا اور غیر ضروری پند و نصیحت سے گریز اور اجتناب نہ کرے گا۔ اور وہاں حوریں اس کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گی۔ اور یہ شراب طہور کے پینے سے بھی انکار کرے گا اور روٹھ جائے گا۔ لہٰذا اس کو جنت کسی صورت راس نہ آئے گی۔

فقر و درویشی

ڈاکٹر اقبال کی نظر میں حقیقتاً فقر و درویشی وہی قابل عزت اور حرمت ہے جس کے متعلق جناب رسول مقبول نے فرمایا ہے۔ "الفقر و فخری"، لیکن یہ آجکل کا فقر نہ اقبال کی نظر میں فقر ہے اور نہ درویشی، درویشی! اسی لئے آپ اس فقر کو جس کی طرف لفظاً اسداللّٰہی یعنے جناب امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اشارہ کیا ہے۔ اس کی مدحت اور تعریف کرتے ہیں اور آجکل کے فقر کی برائی اور مذمت۔

آپ مدح فقر و درویشی فرماتے ہیں۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے

خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

آپنے فقر و درویشی کو کس قدر بلند اور ارفع و اعلیٰ بتایا ہے کہ بادشاہی اس کی نظر میں کچھ نہیں۔ ثبوت میں کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ جو خراج کی

بیکم الٹا ہو۔ وہ بادشاہ ہی کیا۔ بادشاہ حقیقتاً وہی ہے جو تمام چیزوں سے مستغنی ہو۔ اور وہ ایک حقیقی فقیر یا درویش ہی ہو سکتا ہے۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں۔

یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی، کہ جسکے سامنے جھکتی ہے مغفوری

لفظ یقین یعنے ایمان آپ نے استعمال کیا ہے اور ایمان صاف قلبی، اور صداقت سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا فرماتے ہیں کہ اگر وہ درویشی حاصل کرنا کوئی چاہے۔ کہ جس کو بادشاہ سلام کرتے ہیں تو ایمان کلی اور صاف قلبی اختیار کر۔ اور درویشی کے مقابلہ میں تخت و تاج کی آپ کوئی حقیقت اور وقعت نہیں سمجھتے جس کے لئے اس طرح کہتے ہیں۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

ایک جگہ اس طرح فرماتے ہیں۔ اور فقر و درویشی کی حقیقت اعلیٰ سے روشناس کرتے ہیں۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

آپ جب وجد میں آتے ہیں۔ اور حضرت علی کی فقیری کی شان کا مطالعہ فرماتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

لیکن ان باتوں کے باوجود اس موجودہ زمانے کو آپ فقر سے بالکل

فقر نہیں سمجھتے۔ فرماتے ہیں۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

علم و فقر

آپ علم اور فقر میں امتیاز ظاہر فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علم اور چیز ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور فقر اور شے ہے اور اس کا کام اور۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

فقر اور علم کے متعلق آپ اپنے نظریے کو پیش کر رہے ہیں کہ علم انسان کی عقل کو روشن اور قوت بخشتا ہے اور فقر انسان کے قلب اور نگاہ کو عفت اور عصمت۔

علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

آپ رتبۂ فقر کو علم کے درجے سے بہت بلند جانتے ہیں جس کو لے کہا ہے کہ علم صرف حکمتیں اور ترکیبیں سوچتا ہے اور فقر مردوں کو زندہ کرتا ہے اور خدا سے ہمکلام ہوتا ہے۔ علم صرف راستہ ہی تلاش کرتا رہتا ہے اور فقر تمام راستوں سے واقف ہے اور خدا تک پہونچ جاتا ہے۔

اس سے اور آگے بڑھ کر اس طرح فرماتے ہیں۔

فقر مقام نظر، علم مقام خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

گدائی

ڈاکٹر اقبال نے سرمایہ داری اور مزدوری کے مسئلہ پر جو خامہ فرسائی کی ہے وہ بھی قابل داد اور لائق تحسین ہے۔ کہ ڈاکٹر اقبال انتہائی حساس اور دردمند انسان تھے۔ جیسا کہ خود الگ مقطع کہہ گئے ہیں۔

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

بہرحال آپ نے ایک نظم جس کی سرخی "گدائی" ہے اس انداز سے لکھی ہے جو اپنے مقام پر خود آپ اپنی مثال ہے۔ اس نظم میں آپ نے ظاہر کیا ہے کہ بادشاہ مزدوروں کے بل بوتے پر بادشاہی کرتے ہیں۔ اور عیش اڑاتے ہیں اور مزدور کو بادشاہ آنکھ اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔ فرماتے ہیں۔

میکدے میں ایک دن اک مرد زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا

اک مختصر اور متاثر نظم کی تمہید جس خوبی سے آپ نے اٹھائی ہے۔ وہ دوسرے کا کام نہیں یہ دو شعر نظام و نظم قائم کرنے کے سلسلہ میں فرمائے ہیں اس کے بعد یوں فرماتے ہیں۔

اس کے آب لالہ گوں کی خون دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا

یعنے دہقان اپنی محنت اور مفلوک الحالی اور بادشاہ کے تعیش اور آرام طلبی کا احساس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ہم پر ظلم نہیں تو اور کیا ہے آخر اس کو کیوں بادشاہ بنایا ہے۔ دن اور رات دھوپ میں سردی میں کھیتوں سے اناج پیدا کرتے ہیں خدا سے دعائیں کرتے ہیں کہ ہم کو روزی عطا ر لیکن جب غلہ تیار ہو جاتا ہے تو وہ بادشاہ چھین لیتا ہے۔ یہ کس قسم کی.. بادشاہی ہے۔ جو دوسروں اور وہ بھی غریبوں کی محنت اور مشقت سے حاصل کی ہوئی روزی کی محتاج ہے۔ مانگنے والے کو تو بادشاہ کہنا روا نہیں وہ فقیر اور گدا ہے۔ اور ہر مانگنے والا گدا ہوتا ہے۔ لہذا یہ بادشاہ بادشاہ نہیں بلکہ بے حیا گدا ہے۔

اس ہی موضوع کے ماتحت آپ نے ایک نظم فرمان خدا کے عنوان سے لکھی ہے۔ جو خدا کی طرف سے ہے۔ اور خدا نے فرشتوں سے خطاب کیا ہے فرماتے ہیں۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

یہاں بھی سرود رنوازی اور امراء اور سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اس کے آگے فرماتے ہیں۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

یعنے ان غلاموں کو جو بصورت مزدور غربت اور افلاس میں زندگی

گذار رہے ہیں ان کے ایمانوں کو مضبوط اور مکمل کردو اور ان بے بس انسانوں کو قوت عمل عطا کردو تاکہ یہ ان انسانوں کا مقابلہ کر سکیں جو انکا خون چوسے ہیں اور اڑانے ہیں۔ اس کے بعد نظم میں اور جوش بڑھتا ہے۔ اور تیور بدلتے ہیں۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کا جلادو

یعنے دہقان محنت اور مشقت کرے اور پھر بھی ان کو روزی میسر نہ آئے تو اس کھیت میں غلہ پیدا ہونے سے فائدہ؟ لہذا اس کھیت کو آگ لگا دینی چاہیے۔

زمانہ

یہ بھی ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم کا موضوع ہے جس میں آپ نے دکھلایا ہے کہ زمانہ کیا ہے اور اس کے احساسات کیا، اور زمانہ کس کو کہتے ہیں۔
زمانہ بدلتے رہنے والی چیز ہے اس ہی لئے زمانہ کی تین قسمیں ہیں ماضی حال، مستقبل۔ ماضی گذرا ہوا۔ حال موجودہ، مستقبل آنے والا۔ اور یہی دنیا کی بے ثباتی کی دلیل ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

ڈاکٹر اقبال نے اپنے اس شعر میں تینوں زمانوں کو دکھلایا ہے اور اس کی حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔ جو تھا نہیں ہے، یعنی ماضی میں جو تھا وہ اب نہیں ہے یعنی یہ کہ جو وقت گذر جاتا ہے پھر ہاتھ نہیں آتا بقولے۔

"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں.."

"جو ہے نہ ہوگا۔ یعنی موجودہ زمانہ کی ناپائیداری پر روشنی ڈالی ہے۔ کہ جو کچھ کرنا ہے کر لو ورنہ یہ وقت جو اس وقت میسر ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ" یعنے مستقبل میں جو آنے والا ہے۔ اس کا دنیا والوں کو اشتیاق ہے جیسے کہ ہر نئی آنے والی چیز کا انتظار ہوتا ہے۔ خواہ بہتر ہو یا بد تر۔"

"یہی ہے اک حرف محرمانہ" کہہ کر آپ نے اہل دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ یہ ایک اللہ کا راز ہے اور اس کو ہم بے ثباتی اور ناپائیداری پر محمول کرتے ہیں۔ اس سے سبق حاصل کرو۔ اور وقت فضول رائیگاں نہ کرو۔

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں

یہ ڈاکٹر اقبال کی نظم کا عجیب و غریب عنوان ہی بغیر نظم کے پڑھے ہوئے انسان کو لطف اندوز کر دیتا ہے اور دل میں نظم پڑھنے کا اشتیاق پیدا حضرت آدم جس وقت زمین پر بھیجے جاتے ہیں۔ اس وقت فرشتے کہتے ہیں۔ سے

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

یعنے اے انسان تیری تخلیق کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ تو خاکی ہے یا سیابی اس لئے کہ تجھ کو آسمان سے زمین پر پہونچا جا رہا ہے۔ جہاں تو دن اور رات سرگرداں

اور بیتاب رہے گا تحقیق سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ تو خاک سے پیدا کیا
گیا ہے لیکن تجھ کو دیکھ کر یہ بھی نظر آتا ہے کہ تیری سرشت میں نور بھی شامل
ہے۔ اس کے بعد فرشتے کی طرف سے فرماتے ہیں۔ کہ تیری مقبولیت کا
سبب اگر ہو سکتا ہے تو صرف یہ

گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی

یعنی تو صبح کو خدا کی درگاہ میں رو رو کر بندگی کرتا ہے اور اس
کو اپنا خالق تصور کرتا ہے۔ اس ہی چیز نے تجھ کو مقبول کیا ہے۔ اور تجھ کو
زمین کا خلیفہ بنایا ہے۔

روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

اس نظم کے ساتھ ہی آپ کی یہ نظم موجود ہے جب حضرت آدمؑ آسمان سے
رخصت ہو کر زمین کی طرف آتے ہیں تو یہاں ارضی روح آپ کی آمد سے
خوش ہوتی ہے اور زمین کے مناظر کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اور ان کی
طرف دیکھنے اور ان سے لطف حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہے فرماتے ہیں

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

آیئے آپ کو پہلے آپ آسمان پر تھے وہاں کے مناظر اور تھے اب یہاں زمین
کی سیر کیجئے اور دیکھئے کہ یہاں سے فلک کیسا معلوم ہوتا ہے اور یہاں کی
فضا کیسی ہے مشرق کی سمت سے سورج نکلتا ہوا کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس
منظر کی طرف متوجہ ہوجیئے اور لطف حاصل کیجئے۔

دوسرے شعر میں کہتے کہ وہ جلوۂ خداوندی جس کو آپ نے آسمان پر بے
نقاب اور بے حجاب دیکھا ہے۔ یہاں پردوں میں پوشیدہ دیکھئے،، اور اس
کی جدائی کی تکالیف کا احساس کیجئے جو آپ کو بیتاب کریں گی اور زندگی بیم
ورجا میں گزرے گی۔ یہی دنیا ہے اور یہی زمین۔ لیکن ان امید و بیم کے طائع
میں یہ بھی ضرور ہے کہ آپ کو یہاں کا سردار اور خلیفہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہاں
کی ہر شے آپ کی فرماں بردار رہے گی۔ یہ بادل یہ زمین یہ صحرا یہ سمندر یہ
ہوائیں سب آپ کی فرماں بردار رہینگی۔ اب یہاں آپ اپنا راج دیکھئے اور
حکمرانی کیجئے۔

فرشتے فلک پر جلوہ فگن میں یہاں آپ اپنی بہار دیکھئے

اسی طرح یہ نظم آخر تک اچھے اچھے عنوانات کے ساتھ چلی گئی ہے۔ اور نئے
انداز سے آپ کو دنیا کی چیزوں سے آشنا کیا ہے۔

اس نظم کے بعد آپ کی ایک نظم ہے جو جبرئیلؑ اور ابلیس کے مکالمہ
کی صورت میں ہے اور اس کی سرخی بھی "جبریلؑ وابلیس" ہے

"جبریلؑ وابلیس"

آغاز نظم میں ڈاکٹر اقبالؒ حضرت جبریلؑ کی طرف سے فرماتے ہیں اور اس

طرح کہ حضرت جبرئیل، ابلیس سے سوال کرتے ہیں۔

ہمدم دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو

ابلیس اس کا جواب دیتا ہے کہ دنیا میں یہ یہ چیزیں ہیں۔

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو!

اسکے بعد جبرئیلؑ کہتے ہیں کہ ابلیس تیرا ذکر ہر وقت آسمان پر ہوتا رہتا ہے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تو اپنی خطاؤں کی معافی مانگ لے اور پھر آسمان پر آ جائے۔

جس کا جواب ابلیس دیتا ہے۔

آہ اے جبریل۔ تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

یعنی اے جبریل یہ عجب راز ہے کہ جس کو تم نہیں جانتے اب میں کسی صورت آسمان کی فضا تک نہیں پہونچ سکتا۔

اس کے بعد حضرت جبریل یوں کہتے ہیں اور اس کے آدم کو سجدہ نہ کرنے کے فعل کو یوں یاد دلاتے ہیں۔ جس کو ڈاکٹر علامہ اقبال کس انداز سے ادا کرتے ہیں۔

کھو دیئے انکار سے تو نے مقامات بلند
چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس کی عرضداشت

آپ نے دنیا کی بد اعمالیوں اور بدکاریوں اور بدنظمیوں سے متاثر ہو کر نظم لکھی ہے۔ جس کا عنوان ابلیس کی عرضداشت ہے اور اس بارے میں مغرب پرستی پر کس خوبصورتی سے اعتراض کرتے ہیں۔

نا پاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتوےٰ ہے کہ ہے پاک

اس کے بعد آپنے یہاں کی عورتوں کی مغربیت پر ہٹ کیا ہے اور کس خوبصورتی کے ساتھ فرماتے ہیں۔

تجھ کو نہیں معلوم کہ حوران بہشتی
ویرانیٔ جنت کے تصور سے ہیں غمناک

آخر ابلیس کہتا ہے کہ میں اب اس دنیا میں رہ کر کیا کروں گا جہاں مجھ جیسے اور بہت سے شیطان موجود ہیں اس کو اقبال اس طرح فرماتے ہیں۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

سینما

ڈاکٹر اقبال کی وسعت نظر کی داد نہیں دیجا سکتی، آپ نے ہر چیز سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا "سینما" جسمیں ہزاروں اور لاکھوں مرد عورتیں۔ اور حسین عورتیں۔ عریاں و نیم عریاں بیباکی اور دلیری سے کرشمہ سازی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نہ دیکھ سکے اور اس کو اس طرح ادا کیا۔

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
سینما ہے یا صنعت آذری ہے

یعنی اس ہی طرح جس طرح پہلے آذر مشہور بت تراش بت تراشی کرتا تھا اور بت فروخت کیا کرتا تھا۔ اس ہی طرح اب بھی سینما کی صنعت میں بتگری اور بت فروشی ہو رہی ہے "

وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا
یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے

آپ فرماتے ہیں کہ نہ وہ صنعت تھی اور نہ یہ صنعت ہے وہ تو شیوۂ کافری تھا یعنی وہ اس قسم کے بت تھے کہ وہ ایک جگہ رکھ کر پوجنے کے کام آتے تھے اور یہ وہ بت ہیں کہ جو دل و نظر پر جادو کا کام کرتے ہیں۔ اور اخلاق کو خراب کرتے ہیں

جاوید کے نام

"جاوید کے نام" کے عنوان سے ایک نظم آپ نے لکھی ہے، جس میں عشق حقیقی کرنے کی طرف دعوت دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اس کے بعد معرفت میں ڈوب جانے اور عشق حقیقی میں اس طرح گم اور حل ہو جانے کو کہا ہے کہ ہر شے میں جلوۂ الٰہی نظر آنے لگے۔

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

اس کے بعد آپ آخر میں فرماتے ہیں کہ میں فقیر ہوں اور فقیری ہی کو پسند کرتا ہوں لہٰذا تم بھی اپنی فقیری میں مست رہو اور اس فقیری کی تلاش کرو۔ اور اس فقیری میں گم ہو جاؤ جسکو درویشی کہتے ہیں جس سے خودی حاصل ہو اور خودی قائم رہے فرماتے ہیں۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر